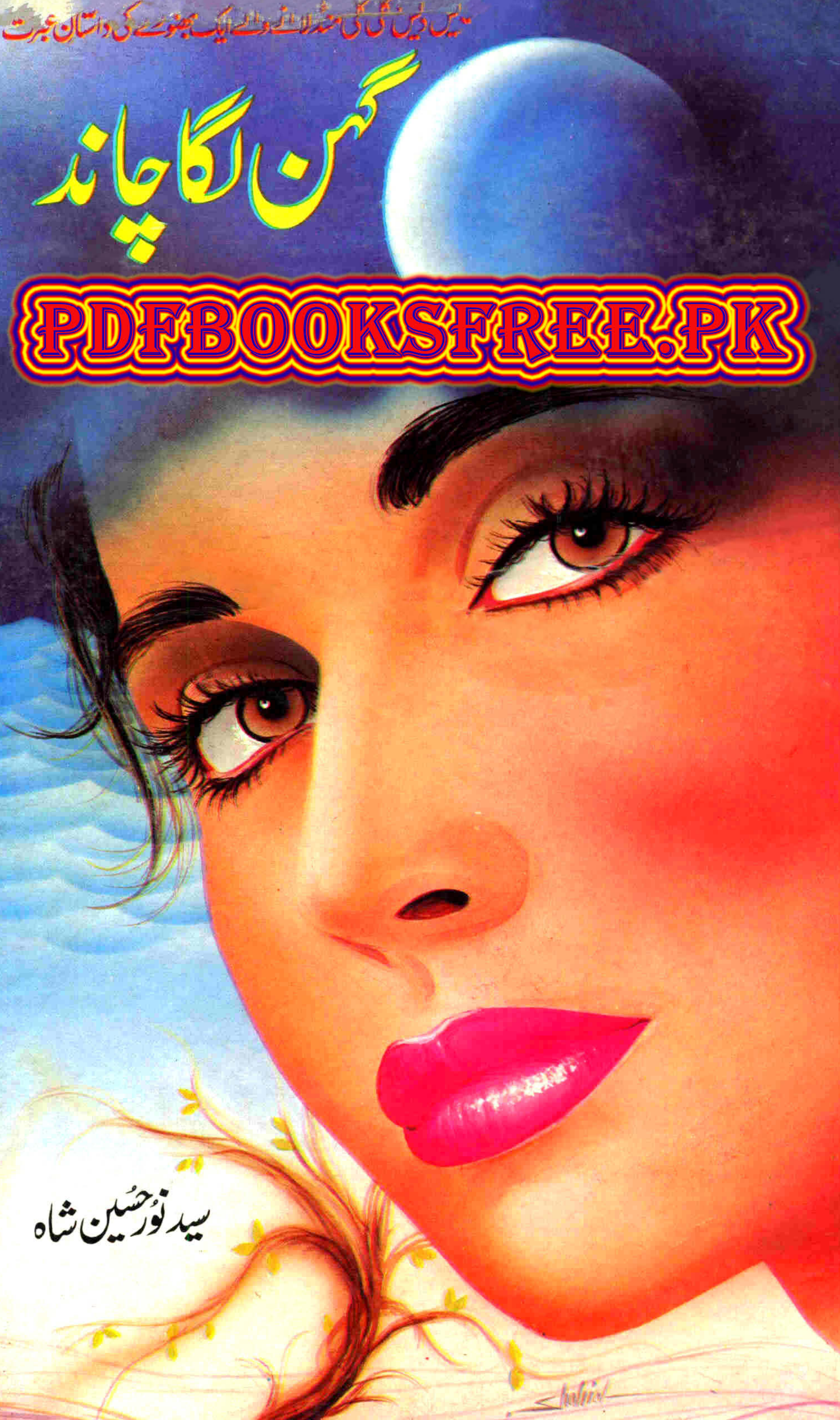

کلی کلی منڈلانے والے ایک بھنورے کی داستان عبرت
گہن لگا چاند
PDFBOOKSFREE.PK
سید نور حسین شاہ

پہلی بار ---------- 1992
قیمت ---------- 100روپے
مطبوعہ ---------- ابن حسن آفسٹ پریس
ہاکی اسٹیڈیم' کراچی
ناشر ---------- نور حسین شاہ
محلہ بلوچاں والا' پنڈدادنخاں۔ ضلع جہلم

کمپوزنگ
اردو کمپوزرس
34 - رمضان چیمبرز بلموریا اسٹریٹ آئی آئی
چندریگر روڈ کراچی 74200 فون نمبر 219911



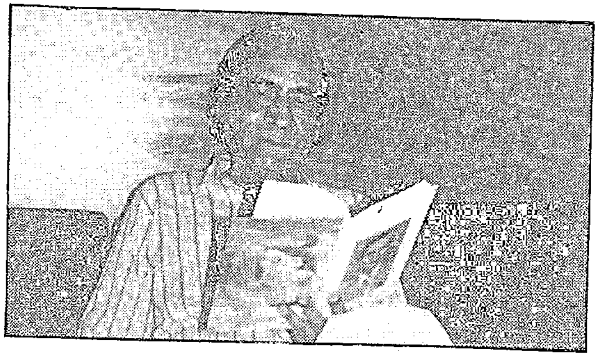
مقدمہ

نور حسین شاہ دوچار برس قبل اردو ادب کی دنیا میں ایک نووارد کی طرح آئے اور گزشتہ برس جب ان کے افسانوں کا مجموعہ "موردِ الزام آدم زادی" کے نام سے شائع ہوا تو اس پر رائے دیتے ہوئے سید ضمیر جعفری نے لکھا تھا کہ "نور حسین شاہ کے جذبات و احساسات لفظوں میں ڈھل کر اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔" اپنی اس تحریر میں سید ضمیر جعفری نے امید ظاہر کی تھی کہ مستقبل میں "موردِ الزام آدم زادی" کا مصنف اس سے بہتر تخلیق یقیناً پیش کرے گا۔

جب سید نور حسین شاہ کے نئے ناول "گہن لگا چاند" کا مسودہ میں نے سرسری طور پر دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ برادر محترم سید ضمیر جعفری کی امید ایک پیش گوئی بن کر ہمارے سامنے آرہی ہے۔ اگر "موردِ الزام آدم زادی" نور حسین شاہ کا نقش اول ہے تو "گہن لگا چاند" ان کا نقش ثانی اور ظاہر ہے کہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول۔

سید نور حسین شاہ ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں اور انہوں نے زیرِ نظر ناول بھی اپنی اول تصنیف کی طرح معاشرے میں اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے اردو دنیا نور حسین شاہ کی اس ادبی کاوش کو قدردانی کی نظر سے دیکھے گی۔

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
گاندھی نگر۔ جموں توی
انڈیا
۲۱۔ مئی ۱۹۹۲ء



میری نظر میں

انسانی رشتوں کی بوقلمونی بعض اوقات ایسے فتنہ ہائے جگر گداز پیدا کردیتی ہے جنہیں محو کرنا انسانی عقل سے بعید معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ایک صحیح فنکار ان کا تجزیہ کرے اور اپنے رشتوں کی نزاکت اور پیچیدگیوں کا فنکارانہ طریقے سے جائزہ لے تو حقائق چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہوجاتے ہیں۔

جناب نور حسین شاہ صاحب کو اس اعتبار سے داد دینی پڑتی ہے کہ وہ رشتوں کی حقیقت اور اس کی پیچیدگیوں سے کہیں بھی نہ تو سہمے ہیں اور نہ انہیں نظرانداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کے تمام کردار جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں جن میں نیکی اور بدی دونوں طاقتیں نبرد آزما دکھائی دیتی ہیں لیکن نیکی بالاخر کامیاب ہوجاتی ہے۔ میرے خیال میں محترم شاہ صاحب کی یہ کاوش ہماری زندگی کی جیتی جاگتی ترجمان ہے۔ وہ اس لئے کہ صاحب موصوف کا قلم حقائق کی صورت بنی کے سلسلے میں کہیں نہیں چوکتا اور وہ بے باکانہ انداز سے ہی نہیں بلکہ جچے تلے فنکارانہ انداز سے بھی بات کہنے کا شعور رکھتے ہیں۔ اور قارئین جانتے ہیں کہ یہ قلندرانہ اندازِ اظہار کسی صاحبِ دل، صاحبِ نظر اور صاحبِ عرفان ہستی ہی کو میسر آسکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ ناول "گہن لگا چاند" اپنا صحیح مقام حاصل کرے تاکہ جس مقصدیت کو پیش نظر رکھ کر ناول نگار نے خامہ فرسائی کی ہے وہ طشت ازبام ہو کر انسان اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن سکے۔

پروفیسر اصغر سودائی
مجید پورہ۔ شہر سیالکوٹ
مئی ۱۹۹۴ء

تاثرات

خالق "موردِ الزام آدم زادی" سید نور حسین شاہ صاحب ٹیکنیکل گریجویٹ ہیں اور قطر فرٹیلائزر کمپنی ام سعید میں ایک باوقار عہدے پر ایک عرصے سے فائز ہیں۔ دوحہ کی ثقافتی سرگرمیوں میں حاضری دیتے رہے ہیں اور ادبی نشستوں میں بھی ان کا آنا جانا باقاعدگی سے رہا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے رسیا تو شروع سے ہی ہیں۔ اس لئے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے صحافت کی طرف رجوع فرمایا اور مختصر سے عرصے میں ہی اس پیشے کی تمام اونچ نیچ سے نہ صرف باخبر ہو گئے بلکہ پرانے پاکستانی صحافیوں کو بھی کھٹکنے لگے۔ اس رقابت نے انہیں مزید محنت کرنے کا حوصلہ دیا اور پھر قلیل مدت میں ہی سب کو پیچھے چھوڑ گئے۔ میدان صحافت میں ان کا سرفہرست شمار ہونے لگا۔

صحافی سے ترقی کرنے والا یا تو کسی اخبار کا مالک بننے کی کوشش کرتا ہے یا کم از کم ایڈیٹر بن جانے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ قطر میں یہ دونوں کام مشکل ہی نہیں ناممکن ہیں۔ مگر صحافت میں پیش رفت نور حسین شاہ صاحب کا ایک سہانا خواب بن چکا تھا جس کی تعبیر مصنف یا مؤلف بن کر ہی پوری کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے بھی اسی سمت سفر کی تیاری شروع کی۔

دل ودماغ میں وسعت ہو' موضوعات بھرپور ہوں' الفاظ کا ذخیرہ ہو' مشاہدات و تجربات فراواں ہوں اور قلم روانی سے چلنے لگے تو ہر قدم کامیابی کی طرف چل اٹھتا ہے۔ یہی سید نور حسین شاہ صاحب کی داستان ہے۔ ٹیکنیکل پیشے سے تعلق رکھنے کے باوجود ادیب اور مصنف بن گئے۔

ادیب اور مصنف بننا آسان نہیں ہے کیونکہ اس فن کے حصول کے لئے برسوں لگاتار محنت کرنی پڑتی ہے اور کسی نہ کسی معتبر شخصیت کی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ مگر شاہ صاحب نے یہ فاصلہ بڑی سرعت سے طے کیا۔ قومی زبان تو اردو ہے ہی۔ اسے مادری زبان کا درجہ دے کر اردو کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اپنی تحریر میں جدت پیدا کرنے کے لئے نئی نئی ترکیبوں کو ڈھونڈا۔ نئے نئے الفاظ اور اپنی اختراعات سے اپنی تحریر میں نکھار پیدا کرتے چلے گئے۔

اپنی پہلی تخلیق "موردالزام آدم زادی" کے منظر عام پر آجانے اور اس کی واہ واہ نے ان کے حوصلوں میں استحکام پیدا کیا۔ اس سے قبل کہ قلم کو زنگ لگ جائے' سیاہی سوکھ جائے۔ شاہ صاحب نے اپنے نئے ناول کا اعلان فرمادیا جو اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اسے ناول "گہن لگا چاند" کے اقتباسات پاک رائٹرز فورم کی ام سعید کی ایک نشست میں سنا چکے ہیں۔ اس ادبی تقریب میں حاضر ہر سخن فہم' سخن گو' سخن نواز اور سخن پرور نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق داد و بے داد دی۔ پاک رائٹرز فورم کے اراکین نے شاہ صاحب کی جرات مندانہ سعی کو سراہا۔ جس کا شاہ صاحب نے انفرادی و اجتماعی طور پر شکریہ ادا کیا۔

عین ممکن ہے کہ شاہ صاحب کی تقلید میں کچھ حضرات اٹھ دوڑیں۔ کیونکہ شاہ صاحب کی تصنیفات کی رفتار سے وہ بے حد متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔ اور اس کام کو آسان سمجھ بیٹھے ہوں گے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ نور حسین شاہ صاحب نے اس پل صراط کو کس خوبی' عقل مندی اور تیزی سے پار کیا۔ اس ناول میں آپ دیکھیں گے کہ شاہ صاحب کی الفاظ پر گرفت کتنی مضبوط ہے۔ زبان کی باریکیاں' موضوعات کا اچھوتا پن اور روانی سے ضرور آپ متاثر ہوں گے۔

سید نور حسین شاہ صاحب شیشہ نما دل رکھتے ہیں۔ مسکراہٹ کا ان کے چہرے پر قبضہ رہتا ہے۔ دوستوں کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ سب کی عزت کرنا ان کے اصولوں میں ہے۔ شرافت اور صداقت ان کو ورثہ میں ملی ہیں۔ ہر آدمی پر بھروسہ کرکے بارہا زخم بھی کھا چکے ہیں مگر گلہ شکوہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ملنسار' ہمدرد اور ہر ایک کے کام آنے والے انسان ہیں۔ لاتعداد خوبیوں کے مالک شاہ صاحب بے داغ کردار رکھتے ہیں۔

وحید بخش غیاث
گولڈ میڈلسٹ
چیئرمین پاک رائٹرز فورم
دوحہ' قطر

"معروض مصنف"

میرے ناول "گہن لگا چاند" کے مرکزی کردار کا محور قمر ہے جس نے جب جنم لیا تو بہت خوشیاں منائی گئیں کیونکہ وہ بلا کا سندر تھا۔

قمر نے جب بولنا شروع کیا تو اس کے گلابی ہونٹوں سے رس ٹپکتا تھا۔ اس نے پہلا قدم اٹھایا تو اس کے ماں باپ کے دلوں میں جل ترنگ بج اٹھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ پھر وہ زینہ تعلیم چڑھنے لگا۔ وہ اپنے بڑے بھائی آفتاب کے تقابل میں پڑھائی میں کمزور تھا لیکن بقیہ تمام صفات میں وہ اس سے چند قدم آگے تھا۔

آفتاب مرغن غذا اور اعلیٰ پوشاک کا دلدادہ جب کہ وہ ان چونچلوں سے مبرا۔ وہ متحمل تھا۔ اسے جو کچھ مل جاتا کھالیتا' جو پہننے کو ملتا پہن لیتا۔

آفتاب شوخ اور رنگین مزاج تھا۔ وہ الھڑ دوشیزاؤں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور کبھی کبھار مذاق بھی کرلیتا جبکہ قمر منکسر المزاج و مہذب تھا۔ بات کرنا تو کجا وہ کسی مخالف جنس کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اس کی سادگی و بھلے مانسی کا ڈنکا کوبہ کو بجتا۔ وہ گھر اور باہر بھولا تصور کیا جاتا لیکن یہ تو قمر اور اس کا خدا جانتا تھا کہ وہ کتنا زیرک اور چالاک تھا۔ اس نے زمانہ طالب علمی میں ایک سندری حسینہ کے دل کو شیشے میں اتار لیا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

قمر فارغ التحصیل ہوا تو نیوی میں ملازم ہوگیا۔ اس کی بھرپور جوانی کا زمانہ دنیا کی سیر کرتے کرتے گزرا۔ اس نے اپنے اوپر چڑھایا ہوا منافقت کا خول اتار پھینکا اور اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ وہ رنگین مزاج اور عورت رسیا نکلا۔ اس نے اپنی عادات و اطوار سے ثابت کردیا کہ اس کے ظاہر و باطن میں فرق تھا۔ وہ حد درجے کا عیار اور عیاش تھا۔

وہ بہت شکیل و جمیل تھا۔ اس کی رعنائی پر چاند بھی رشک کرتا۔ لیکن اس نے اپنے فعل سے اس امر پر مہر ثبت کردی کہ وہ چاند صرف ان نازنینوں کے لئے تھا جن کے قلوب میں وہ عقیدت کی کرنیں منتشر کرتا۔ وہ جانِ جاناں قرابت داروں کے لئے اسم بامسمیٰ نہیں تھا۔ وہ ان کے لئے گہن لگا چاند تھا۔ اس نے اپنے کرتوتوں سے ان کے معصوم دلوں میں گھپ اندھیرا بکھیر دیا تھا رنگین ملک برطانیہ کی دلربا فرنگی حسینہ الزبتھ سے شادی کر کے اور معصوم بیوی کو طلاق دے کر اس نے اپنے ماں باپ' بھائی اور بیوی کے دلوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔

قمر نے الزبتھ کے ساتھ بھی وفا نہ کی۔ وہ طمطراق کے ساتھ اپنی حسین راہ پر چلتا رہا۔ اس نے الزبتھ کی بہن مارگریٹ کو بھی نہ بخشا۔ اس نے غنچۂ ناشگفتہ کا رس بھی چوس لیا۔ اس کے اس مذموم فعل کی بدولت الزبتھ نے اس سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کرلی۔

پھر اس نے نیویارک کی پری شمائل میری سے شادی رچالی۔ لیکن وہ شادی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ شاید مکافاتِ عمل شروع ہوگیا تھا۔ میری نے بری طرح اسے دھتکار دیا اور طلاق دے دی۔

آخر میں وہ غزالہ نامی پاکستانی نژاد حور کا اسیر بنا۔ غزالہ مجسمۂ ہمت و بصیرت نکلی۔ اس نے اپنے ادراک و فہم سے قمر کو زچ کیا اور اسے سیدھے راستے پر چلایا۔

حیف صد حیف وہ بھنورا' اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد رہا۔ وہ صرف اور صرف چند روز بیٹی ڈیانا کی چاہت کی خوشبو سے اپنے دل کو مہکا سکا ..... اور پھر دنیا میں ہی اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگت کر کوچ کر گیا۔

قارئین کرام! میں نے سچائی کی سیاہی میں قلم ڈبو کر اپنا پہلا ناول قلم بند کیا ہے۔ اگر کسی آدم زادے یا کسی حوا کی بیٹی کا کوئی دلخراش حادثہ یا واقعہ ناول کے کردار سے مطابقت رکھتا ہو تو وہ اسے تقاضائے وقت و فطرت سمجھتے ہوئے مجھے معاف کردے۔ ویسے بھی اس سچے ناول کے تمام کرداروں کے نام میں نے تبدیل کردئے ہیں۔

میں نے اپنے ناول کو عام فہم الفاظ سے آراستہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے تاکہ عام قاری پر مشکل نویسی و لفاظی کا بوجھ نہ پڑے۔ لیکن سچویشن کو مد نظر رکھتے ہوئے سادہ انگریزی الفاظ کا استعمال ضرور کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے جس انداز سے فرنگی زبان استعمال کی ہے وہ آپ کے دماغ کو تروتازگی بخشے گی۔

آخر میں آپ سے عاجزانہ التماس ہے۔ کیا آپ بھی تخلیق کار کو کچھ عوضانہ دیں گے .... میرا معاوضہ فقط یہ ہے کہ آپ میری تخلیق کو پسند فرمائیں تاکہ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

ہندوستان کے معروف قلمکار جناب جگن ناتھ آزاد جن کے گیارہ شعری مجموعے' آٹھ طویل نظمیں اور سترہ نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں..... آپ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی چونتیس ادبی انجمنوں کے رکن ہیں' بارہ ممالک میں آپ کے پروگرام براڈ کاسٹ اور ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ دنیا کے بیالیس بڑے انعامات و اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ میں موصوف کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ جنہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے ناول پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا۔

پروفیسر محمد اصغر سودائی' جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ اور علامہ اقبال کالج سیالکوٹ میں ۲۰ سال تک بحیثیت پرنسپل خدمات سرانجام دینے کے بعد بطور ڈائریکٹر آف کالجز ریٹائر ہوئے۔ آپ مشہور ملی ترانے پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ کے خالق ہیں۔ آپ صاحب دیوان ہیں۔ میں سودائی صاحب کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں کہ جنہوں نے ایک بونے ادیب کی کاوش کو سراہا۔

میں قطر کے بزرگ شاعر اور پاک رائٹرز فورم کے چیئرمین جناب وحید بخش کا دل کی گہرائیوں سے متشکر ہوں کہ جنہوں نے بھرپور انداز سے مجھے خراج تحسین پیش کر کے گہری

دوستی کا حق ادا کردیا۔

گزشتہ سال میں نے سچی کہانیوں کا مجموعہ "مورد الزام آدم زادی" پیش کیا تھا۔ اس کتاب کے منصب شہود پر آنے کے بعد محولہ ذیل قابل قدر شخصیات نے مجھے مالی یا اخلاقی تعاون سے نواز کر میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں ان معززین کا تہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔ مجھے اس عنصر کا احساس ہے کہ اگر ان محولہ حضرات نے مجھے پذیرائی نہ بخشی ہوتی تو میں اس مختصر سے عرصے میں اپنی دوسری تخلیق نہ پیش کرپاتا۔

جناب میر محمد نصیر مینگل صاحب، سفیر پاکستان

جناب علی مبارک صاحب، فنانس منیجر قافکو

عمر خان علی شیرزئی صاحب، کونسلر سفارت خانہ پاکستان

جناب سید جواد حسین صاحب، منیجر بی آئی اے قطر

جناب ایم اے شاہد صاحب، جنرل منیجر الفروان

جناب رائے منصور احمد خان صاحب، منیجر یو بی ایل قطر

جناب اشفاق حسین صاحب، جنرل منیجر ٹیکنوٹریڈ

جناب ظفر اقبال راجا صاحب

جناب مرزا محمد اکرم صاحب

فیض شاہد صاحب

جناب عبدالحمید صاحب، ایگزیکٹو ڈائریکٹر موسسہ المفتاح

سید جمشید الحسن رضوی صاحب

محمد عظیم خان صاحب

محمد عثمان خان صاحب

○☆○

عبدالستار و بیگم بلقیس ایدھی

جنھوں نے انسانیت، خلقت، ملت کی خدمت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے

نور حسین شاہ

گہن لگا چاند

بہادر خان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پھر نہلے پر دہلا وہ اپنے شہر کا نامی گرامی پہلوان تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی ڈویژن کی سطح تک کوئی پہلوان اسے پچھاڑ نہیں سکا تھا۔ اپنے علاقے میں اس کا طوطی بولتا تھا لیکن پڑھائی کے سلسلے میں کند ذہن تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ امتحان کے دنوں میں چند مشہور سوالوں کا رٹا لگا کر وہ پاس ہو جاتا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا اور وہ دس جماعتیں پاس کر کے پٹواری بن گیا۔

چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ اس نے اپنے آبائی شہر میں دو کنال کے پلاٹ پر عالی شان مکان بنوالیا۔ لیکن اس نے مکان گاؤں کی طرز کا یعنی حویلی نما بنوایا تھا۔ صدر دروازے کے پاس ایک بڑا کمرہ بنوایا تھا جس کے ایک کونے میں اس کی گھوڑی باندھی جاتی اور دوسرے کونے میں بھینس۔ یہ دونوں پالتو جانور اسے تحفے میں ملے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے زرعی زمین بھی خرید لی اور دو نوکر بھی رکھ لئے۔

محکمۂ مال میں کام کرتے ہوئے کچھ ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک روز بہادر خان نے اپنے والد سے کہا ”بابا جانی، خیر سے اب تمہارا بیٹا پٹواری بن گیا ہے۔ اب تمہیں دوسروں کے کھیتوں میں کھیتی باڑی کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔“

”بیٹا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“

”ہاں۔ بابا جانی یہ ممکن ہے..... اب ہمارے پاس پیسوں کی ریل پیل ہے.... اب آپ

اپنے شہر کے لمبردار بن گئے ہو۔ اب تم چوہدری بن کر کام کرو.... چوہدری.... نوکر صبح بیٹھک کھولے گا اور حقّہ بھر کردے دے گا.... پھر غریب لوگ تمہارے پاس آئیں گے' تمہارے پاس بیٹھیں گے' حقہ پییں گے اور اپنے مسائل بیان کریں گے..... اور تم ان کے مسائل کو حل کراؤ گے۔"

بیٹے کی بات سن کر چمن خان کے چمن میں بہار آ گئی۔ وہ شگوفے کی طرح کھلتے ہوئے بولا۔

"بیٹا' تو ٹھیک کہتا ہے..... آج سے میں چوہدری چمن خان ہوں..... چوہدری چمن خان۔"

ایک روز بہادر خان اپنی تحصیل پنڈدادن خان کے ایک قصبے چران کے دورے پر گیا تو وہاں ایک کھیت میں ایک کاشت کار کی بیٹی کو جو دس جماعت پاس تھی کٹائی کرتے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کی زلفوں میں گرفتار ہو گیا۔

○☆○

سخت جاڑے کا موسم تھا۔ چمن خان رضائی لپیٹے لیٹا تھا کہ اس کی جورو ملکانی انگیٹھی میں سرخ کوئلے رکھ کر اندر آئی۔ انگیٹھی کو کمرے کے درمیان میں رکھا اور اپنے سائیں کے پاس بچھی دوسری چارپائی پر لیٹ گئی۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے بھی رضائی کر لی۔

تھوڑے توقف کے بعد چمن خان بولا "او ملکانی...... ملکانی کی بچی!"

"ارے کیا ہو گیا ہے تجھے..... آرام کر کے سو جا.... باہر رم جھم بارش ہو رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں.... اور اندر سردی جوبن پر ہے۔"

"اری۔ بادل گرجتے ہیں تو گرجیں.... میں نے تو تجھ سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔"

ملکانی نے جھٹ رضائی سے منہ نکالا اور شوخی سے بولی "اچھا تو پھر پوچھ.... کیا بات ہے؟"

"ملکانی۔ بہادر خان لاکھوں میں ایک ہے۔ کماؤ پتر ہے.... گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ صرف ایک چیز کی کمی ہے کہ ہمارے کھیلنے کے لئے کوئی کھلونا نہیں ہے.... اس کے لئے ضروری ہے کہ بہادر کو بیاہ دیا جائے۔"

چمن خان اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد بستر سے اٹھا اور ملکانی کے بستر میں گھس گیا۔

"ارے چمن خان ..... یہ کیا! تو میرے بچھونے میں کیوں گھس آیا ہے؟" ملکانی نے چاہت بھرے لہجے سے پوچھا۔

"میری پیاری ملکہ.... میں تیرے بستر میں کیوں دبکا بیٹھا ہوں' یہ مت پوچھ۔ تو صرف اتنا بتا کہ تیرے مست گھوڑے بہادر خان کی لگام کس مستانی کے ہاتھ میں تھماؤں" چمن خان شوخ لہجے میں بولا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد ملکانی آنکھوں میں خوشیوں کے سپنے سجائے بولی "میری بھانجی رضیہ حور ہے حور۔ ابھی دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ دو ماہ کے بعد مارچ کے مہینے میں اس کا سالانہ امتحان ہو گا۔ جونہی وہ امتحان سے فارغ ہو جائے گی بہادر خان کے ساتھ باندھ دی جائے گی۔"

پھر اس نے مسکراتے ہوئے مزید کہا "صبح ہوتے ہی میں اپنی بہن کے گاؤں لالہ شریف جاؤں گی اور اپنی بھانجی کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آؤں گی۔"

"اری نامعقول بیگو.... چراغ تلے اندھیرا کے مصداق تجھے.... میری بھتیجی فاطمہ نظر ہی نہیں آتی کیا... چاند ہے چاند..... اگر اس میں کسی چیز کی کمی ہے تو صرف تعلیم کی.... کند ذہن نے صرف پانچ جماعت پاس کی اور اسکول چھوڑ دیا" چمن خان نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

ملکانی زور سے ہنسی "یہ ہوئی نا بات... تم نے خود ہی تسلیم کر لیا ہے کہ فاطمہ کی تعلیم کم ہے..... رہا حسن کا سوال تو فاطمہ اور رضیہ دونوں ہی چاند کو مات کرتی ہیں۔"

چمن خان نے ملکانی کو پیار سے دبوچتے ہوئے کہا "تو پھر کس کے ساتھ بہادر خان کو باندھا جائے؟"

ملکانی کے دل میں خوشیاں ناچنے لگیں' وہ مسکرا کر بولی "ارے دل جانی... بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ صبح ہونے دو' بہادر خان سے پوچھ لیں گے کہ وہ کس حور سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

چمن خان خوش ہو کر بولا "میری ذہین بیگو.... تو بالکل ٹھیک کہتی ہے۔"

اچانک چمن خان کے بوڑھے دل میں بہار آگئی۔ اس نے فی الفور شمع گل کردی اور اپنے گلستان کی مہک سے اپنے دل کو مہکا وگرمالیا۔

صبح کی آمد نے ہر سُو اجالا بکھیرا تو ملکانی باجرے کی روٹی اور لسّی لے کر اپنے بیٹے کے کمرے میں گئی۔ پیچھے پیچھے چمن خان بھی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دروازے تک پہنچ گیا اور کان لگا کر ماں بیٹے کی بات سننے لگا۔

"بیٹا بہادر خان۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ اگر کسی چیز کی کمی ہے تو ایک مسکراتے اور کھلتے پھول کی۔ اور یہ پھول ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ہم تمہاری شادی کردیں۔" پھر ملکانی نے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں تم سے ایک صلاح لینی ہے' ہمارے خاندان میں دوجوان لڑکیاں فاطمہ اور رضیہ ہیں۔ دونوں ہمارا اپنا خون ہیں۔ دونوں بے حد خوب صورت بھی ہیں' ہم ان میں سے ایک کے ساتھ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس سے شادی کرنا چاہتے ہو' ہم تمہاری مرضی کو دل وجان سے تسلیم کریں گے۔"

جب بہادر خان نے جواب نہ دیا تو ملکانی دوبارہ گویا ہوئی "ہاں بیٹا۔ پھر تمہاری کیا رضا ہے؟"

"ماں.... ماں۔"

"ہاں میرے پھول بیٹا۔"

"ماں۔ میں ان دونوں میں سے کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہائے میں مرجاواں.... بیٹا یہ تونے کیا کہہ دیا۔"

"ہاں ماں یہ سچ ہے۔"

تھوڑے توقف کے بعد اس نے اٹکتے اٹکتے کہا "ماں ..... ماں ... اگر تم .... تم میری شادی کرنا ہی چاہتی ہو تو پھر میری شادی .... گاؤں چراں ..... کی ملکہ کے ساتھ کردو۔"

"ہائے اللہ..... وہ ملکۂ چراں کون ہے؟" اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"اری ماں۔ پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں بتاتا ہوں' وہ ملکہ چراں کون ہے۔ وہ زمیندار

حیات خان کی بیٹی ثریا ہے۔" پھر وہ لقمہ دیتے ہوئے بولا "ماں تمہاری قسم۔ ثریا اسمِ بامسمّٰی ہے۔"

"لیکن کیا حیات خان تجھے اپنی دامادی میں لے لے گا؟"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ تمہارا بیٹا ہیرا ہے' ہیرا۔ وہ اپنی بیٹی کو پٹواری کے گلے باندھنے سے کبھی بھی انکار نہیں کرے گا۔"

اپنے جی دار بیٹے کا لطافت بھر جملہ سن کر ملکانی مسکرادی اور چنگیر و لسّی کا کٹورا اٹھا کر خوشی کے بادلوں میں گھری واپس پلٹ آئی۔ وہ جب بیٹے کے پاس گئی تھی تو مطلع بالکل صاف تھا۔ لیکن جب وہ بیٹے کے کمرے سے باہر نکلی تو نو بج چکے تھے اور سورج گھرے بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ ہر سُو اندھیرا چھا چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ چمن خان پہلے ہی اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

اس سہانے سماں میں ملکانی چمن خان کے کمرے میں داخل ہوئی اور کِھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"اری اری ملکانی' باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے.... اس طرح میرے من میں خوشی کا طوفان اٹھا ہوا ہے۔ شاید تیرے دل کے دریا میں بھی تلاطم آیا ہوا ہے۔ تب ہی تُو بھی بے ساختہ ہنسے جا رہی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں میرے ہنسنے کی تو بات ہی ہے۔"

"تو پھر جلدی سے بتا۔ وہ کیا بات ہے" چمن خان نے نیم جھریوں والے ہاتھ سے ملکانی کے گال کی چٹکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

"بتاتی ہوں' بتاتی ہوں..... ذرا اپنے دل کو تھام تو لو۔"

"اچھا..... لے میں نے اپنے دل کو قابو میں کرلیا۔"

"بات یہ ہے کہ بہادر خان......"

"اری کم بخت بول.... بول ورنہ میرا دل بے قابو ہوجائے گا۔"

"بہادر خان کو تمہاری بھتیجی پسند نہیں ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اسے دودھیا رنگ کے نقش

ونگارو والی ایک مہوش سے شادی کرنا ہے۔"

ملکانی اپنی بات مکمل بھی نہ کرپائی تھی کہ چمن خان زور سے ہنسنے لگا۔

"ارے اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔"

"اری پگلی۔ میں تم دونوں ماں بیٹے کی فرحت آمیز باتیں دروازے کی اوٹ میں کھڑا سن رہا تھا.... میں ہنس اس لئے رہا ہوں کہ مانا وہ میری بھتیجی سے شادی نہیں کرنا چاہتا لیکن بے چاری تیری بھانجی بھی اس کے گلے بندھنے سے بچ گئی.... بے چاری کالی کلوٹی اور موٹی ناک والی....."

"افوہ.... کیوں میری بھانجی کے لئے بے تکی باتیں کررہے ہو۔"

"ملکانی۔ میں تو مذاق کررہا ہوں' مذاق۔ تیری بھانجی اور میری بھتیجی دونوں ایک خودسر گھوڑے کی لگام تھامنے سے بچ گئیں۔"

پھر چمن خان کے دل میں خوشیوں کی آندھی چلنے لگی۔ وہ آندھی بن کر بولا "بہادر خان کس حور سے شادی کرنا چاہتا ہے؟؟"

"وہ.... وہ حیات خان کی بیٹی ثریا ہے" ملکانی نے چہک کر جواب دیا۔

"ملکانی۔ تیرا بیٹا پکّا جوہری ہے۔ اس نے صحیح ہیرے کا انتخاب کیا ہے...... میں پچھلے دنوں ایک ضروری کام کے سلسلے میں حیات خان کے پاس قصبہ چران گیا تھا۔ وہاں اچانک ثریا پر میری نظر پڑ گئی تو میں لٹو ہوگیا..... یقین جان میں لٹو ہوگیا۔"

"ارے' ارے یہ کیا جوانی دیوانی کی باتیں کررہے ہو.... شرم کرو' حیا کرو۔ وہ تمہاری بہو بننے والی ہے۔"

"اری ہونق۔ تُو تو نری بدھو ہے۔ میرے لٹّو ہونے کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ میرا دل بے قابو ہوگیا تھا۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ثریا کو دیکھ کر میرے دل کا خواب لٹو کی طرح گھومنے لگا تھا۔ خواب چکر لگا کر مجھے کہہ رہا تھا' یہی ہے.... تمہارے سپنوں کی تعبیر.... سپنوں کی تعبیر"

بعدازاں چمن خان نے پیار سے ملکانی کو بانہوں میں جکڑ لیا اور بولا "بیگم رانی۔ جب تو

ثریا کو دیکھے گی تو بلاشبہ اپنی انگلی کاٹ لے گی۔"

گھر کے باہر رم جھم پھوار پڑ رہی تھی اور اندر چمن خان اور ملکانی کے مستانہ قہقہوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

دوسرے دن چمن خان اور ملکانی دونوں مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے حیات خان کے گھر گئے۔ ثریا کو سونے کی انگوٹھی اور گوٹا کناری لگی قمیص اور شلوار پہنا کر رسمِ منگنی ادا کی اور ایک ماہ کے بعد شادی کی تاریخ طے کردی۔

پھر دونوں طرفین شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ چمن خان نے اپنے حویلی نما مکان کی خوب تزئین و آرائش کی۔

ہر روز چمن کی حویلی میں عشا کی نماز کے بعد جوانان سرو والان میں محفل سجائے اور اندرونِ خانہ نازنینیں ڈھولک کی تھاپ پر رات گئے تک گیت گاتی رہتیں۔ برات والی رات لاہور سے معروف گانے والیوں کو بلا کر مجرا کرایا گیا۔ چمن خان نے اپنے بیٹے کی شادی پر روپیہ پانی کی طرح بہایا اور شادی دھوم دھام سے کی۔

ثریا اور بہادر خان کی شادی اپنے علاقے میں اپنی نوعیت کی بے مثال شادی تھی۔ لوگ عرصۂ دراز گزرنے کے باوجود ان کی شادی کو بھول نہ پائے.... جب کبھی کسی جوڑے کو بیاہا جاتا تو ان کی بے نظیر شادی ضرور موضوعِ سخن بنتی۔

○☆○

بہادر خان و ثریا یک جان دو قالب بن چکے تھے۔ وہ گلاب کا پودا تھے جس کی دو ٹہنیاں تھیں۔ پھر ایک ٹہنی سے خوب صورت غنچے نے سر نکالا۔ جس کا نام آفتاب رکھا گیا۔ آفتاب علی۔

آفتاب کی پیدائش کے لگ بھگ دس ماہ کے بعد اس ٹہنی پر دوسرا غنچہ کھلا۔ جس کا نام قمر علی رکھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خوب صورت کلیاں کھل کر گل بن گئیں۔

آفتاب نہایت ہی شریر و طرار نکلا۔ وہ ہر وقت ہنستا و مسکراتا رہتا۔ ہر آدم زاد چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا اور ہر حوّا زادی چاہے وہ محلے کی لڑکی ہو' خالہ ہو یا چچی.... ہر ایک سے تمسخرانہ انداز میں گفتگو کرتا اور ان پر شائستگی سے فقرے چست کرتا۔ وہ ذہین و فطین بلا کا تھا۔ وہ اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کرتا۔

اس کے بر عکس قمر نہایت ہی خاموش طبع تھا۔ وہ ہر ملنے والے سے عزت و احترام سے پیش آتا اور دوشیزہ چاہے وہ اس کی قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو' اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اس کی شرافت کا ڈھنڈورا کُوبہ کُو پیٹا جاتا۔

لیکن وہ انتہائی کند ذہن تھا۔ اسے پڑھائی سے رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف امتحان کے دنوں میں پڑھتا۔ وہ بھی گیس پیپرز سے چیدہ چیدہ سوالات کے جوابات رٹ لیتا تھا اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کر لیتا تھا۔ مزید بر آں قمر کو قسم قسم کے کھانوں سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ گھر میں جو چیز بھی پکتی وہ بخوشی کھا لیتا۔ اس کے لئے گھر کی دال بھی مرغی کے برابر ہوتی۔

قمر آٹھویں جماعت اور آفتاب دسویں جماعت میں پہنچ گئے۔ قمر کو آٹھویں جماعت میں پروموٹ ہوئے ایک ماہ کا عرصہ بیت پایا ہو گا کہ اسے ہاکی اور کبڈی ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ اس نے اپنے شاندار کھیل سے پورے علاقے میں اپنی مہارت اور طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ اس کی قیادت میں کبڈی ٹیم نے راولپنڈی میں ڈویژنل مقابلوں میں فائنل جیت کر میدان میں اپنے اسکول کی شہرت کے جھنڈے گاڑ دئے۔

آفتاب کو کھیلوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اگر اسے شوق تھا تو پڑھنے اور مرغن غذائیں کھانے کا' وہ جب اسکول سے پڑھ کر گھر واپس آتا تو سیدھا رسوئی میں گھس جاتا اور ہانڈی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھتا۔ اس دن اگر گوشت' مرغی یا کلیجی وغیرہ کا سالن پکا ہوتا تو اس کا دل خوشی سے اچھل پڑتا۔

لیکن اگر کریلہ' دال اور بھنڈی وغیرہ پکی ہوتی تو اس کا منہ لٹک جاتا۔ وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیتا۔ پھر مجبوراً اس کی ماں ثریا اسے آملیٹ بنا کر دیتی اور بڑی منتوں سے اسے کھانا کھلاتی۔ پھر بھی وہ روٹی ناک بھوں چڑھا کر کھاتا۔

آفتاب ایک اضافی خوبی کا مالک تھا۔ وہ دوستوں کا دوست تھا۔ ہر آڑے وقت میں ان کے کام آتا۔ اپنی پاکٹ منی سے وہ نادار لڑکوں کی فیس بھی ادا کر دیتا۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ کلاس کا ذہین ترین لڑکا عزیز اسکول نہیں آیا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ چھٹی تک وقت گزارنا اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھا عزیز کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو عزیز نے ہی دروازہ کھولا۔

وہ اپنے سامنے آفتاب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس لئے کہ آفتاب ہمیشہ عزیز سے حسد کرتا تھا۔ وہ اس سے الرجک تھا۔ جب کہ وہ دوسرے لڑکوں سے پیار کرتا تھا۔ آفتاب اس سے الرجک و متنفر اس لئے تھا کہ کبھی کبھار وہ پڑھائی میں اس پر سبقت لے جاتا تھا۔ آفتاب بھی پڑھائی میں کچھ کم نہ تھا لیکن حساب میں اس کی پوزیشن قدرے کمزور تھی جبکہ عزیز حساب میں ہمیشہ پورے نمبر لے کر پاس ہوتا اور فرسٹ بھی آجاتا۔

آفتاب کلاس میں سیکنڈ پوزیشن حاصل ہونے پر کفِ افسوس ملنے لگتا۔ رہ رہ کر اسے عزیز پر غصہ آتا۔ وہ نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہتا "بچّو' صرف دو نمبروں کے فرق سے فرسٹ آئے ہو..... مستقبل میں کیسے فرسٹ آتے ہو' میں دیکھوں گا' میں رات دن پڑھائی میں ایک کر دوں گا۔ لیکن تجھے فرسٹ نہیں آنے دوں گا۔"

عزیز مسکرا کر جواب دیتا "میرے دوست اگر تم فرسٹ آگئے تو مجھے تم سے زیادہ خوشی ہو گی اس لئے کہ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ اللہ محنت کا ضرور پھل دیتا ہے۔"

"مت کہو مجھے دوست" آفتاب پھٹکار برساتے ہوئے کہتا۔

اس روز عزیز اپنے حاسد کو گھر میں پہلی دفعہ دیکھ کر طرب و تحیر کے امتزاج سے بولا۔

"آج.... آج آفتاب مغرب سے کیسے طلوع ہوگیا ہے؟"

"ارے یار دیکھو تو سہی .... سورج مغرب میں ہی تو نظر آرہا ہے۔ وہ کوہ کے دامن میں پناہ لے رہا ہے.... ہر سو ملگجا اندھیرا بکھرا ہے۔ شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔" آفتاب نے ڈوبتے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چند ثانیوں کے توقف کے بعد آفتاب متبسّم ہو کر بولا "ارے عزیز۔ چھوڑو شکوے شکایتوں کو.... آؤ باہر آؤ۔ اس سہانے موسم میں باہر کی سیر کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"اوکے آفتاب" عزیز نے خوش کن لہجے میں کہا۔

پھر وہ دونوں چلتے چلتے نہر کے کنارے آکر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں آخر آفتاب اپنا مدعا یوں زبان پر لایا۔

"عزیز، دیکھو پانی کتنے ٹھاٹ سے بہہ رہا ہے جس سے ہم دونوں کو تازگی اور خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر یہی پانی ٹھہر جائے تو میلا ہو جائے گا اور اس سے بدبو آنے لگے گی پھر اس کی طرف سے اٹھنے والی ہوا ہمارے ذہنوں کو بھی زنگ آلود کردے گی۔ ہم کند ذہن و کاہل ہو جائیں گے۔ ہماری پیش رفت رک جائے گی۔ لانگ رن میں ملت و قوم کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ملک کی ترقی و خوشحالی میں ٹھہراؤ آجائے گا۔"

آفتاب نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست نے اسکول چھوڑ کر اپنی زندگی پر جمود طاری کیوں کردیا ہے، آج تم اسکول کیوں نہیں آئے؟ ملک ایک ہونہار بچے سے محروم ہو جائے گا، کیا تم پڑھ لکھ کر بڑا آدمی نہیں بننا چاہتے؟ کیا تم ملک کی خدمت نہیں کرنا چاہتے.... کیا تم اپنا اور اپنے ملک کا مستقبل نہیں سنوارنا چاہتے..... بولو..... جواب دو۔"

آفتاب کا پند سے بھرپور لیکچر سن کر عزیز کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ افسردہ ہو کر بولا "میرے بھائی، میں کیسے.... میں کیسے اسکول آتا؟"

"ہاں۔ ہاں بولو نا.... بولو تو سہی، منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈال لی ہیں" آفتاب نے ذرا طیش میں آکر کہا۔

عزیز نے جھجکتے جھجکتے جواب دیا "میرے بھائی، اب میں تعلیم کے مزید زینے طے کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ میں اسکول کی فیس ادا کرسکوں، فیس نہ دے پاؤں تو ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے اسکول سے نکال دیں گے۔ ایسے ہی جیسے پچھلے دنوں ماجد کو اسکول سے نکال دیا گیا۔"

"بھائی یہ ماجد کون ہے؟"

"تم اسے نہیں جانتے ہو۔ وہ ہماری گلی میں رہتا ہے۔ وہ بہشتی نورے کا بیٹا ہے؟"

"وہ کس کلاس میں پڑھتا تھا؟"

"وہ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔"

"افوہ" آفتاب نے افسردہ ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر کفِ افسوس ملنے کے بعد آفتاب خندہ زیرِ لبی گویا ہوا "ابھی تم نے مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا ہے.... کہو ٹھیک ہے نا، بولو بھی بھائی۔"

"ہاں۔ میں نے تمہیں بھائی کہا ہے... تم میرے بھائی ہو۔"

"تو پھر کل تم اسکول آؤ گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ تم میرے بھائی ہو۔"

"بھائی تو تم میرے ہو ہی لیکن فیس۔"

"تمہاری فیس تمہارا بڑا بھائی آفتاب ادا کرے گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آفتاب بھیا۔"

پھر دونوں خوشیوں کو گلے لگائے بغل گیر ہوگئے اور دوستی کا روشن مینارہ بن گئے۔ ان کی بے نظیر دوستی کا چرچا ہر طرف پھیل گیا۔ ان کے کلاس فیلوز ان کی اخوت و عقیدت بے مثال پر رشک کرنے لگے۔

بعد ازاں وہ میٹرک کے سالانہ امتحان کی تیاریوں میں لگ گئے۔ انہوں نے مل کے مشاورت و محنت میں ڈوب کر پڑھا۔

امتحان دیا۔ نتیجہ نکلا۔ ان کی محنت رنگ لائی۔ دونوں نے اسکالرشپ حاصل کی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد عزیز کو فیس کا کوئی پرابلم نہ رہا کیونکہ وظیفے سے اس کی تعلیم کے اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے تھے۔

آفتاب کو کسٹم آفیسر بننے اور عزیز کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ لہٰذا دونوں نے لاہور جا کر الگ الگ کالجوں میں داخلہ لے لیا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگے۔

ان کی منزلیں جُدا ضرور ہو گئی تھیں لیکن وہ اکثر آپس میں ملتے رہتے تھے۔ جمعہ کے روز تو وہ ضرور ملتے۔ اکٹھا کھانا کھاتے اور کسی تفریحی جگہ پر سیر کرنے چلے جاتے یا کوئی فلم دیکھ لیتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اکٹھا گھر آتے تھے۔

پھر دونوں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ بارہویں جماعت پاس کر لی۔ عزیز کو میرٹ کے لحاظ سے راولپنڈی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا جبکہ آفتاب کسٹم آفیسر بن گیا۔

پھر اُن کے میل ملاپ میں کمی آ گئی۔ آفتاب نوکری کے گورکھ دھندے میں الجھ گیا اور عزیز ڈاکٹری کی تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ملاقاتیں معدوم ہو گئیں۔

○☆○

آفتاب کے کسٹم آفیسر بن جانے کے بعد قمر بھی دسویں جماعت کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ بہادر خان نے لاکھ کوشش کی کہ قمر اپنے بھائی کے پاس لاہور چلا جائے اور وہاں کالج میں داخلہ لے لے لیکن اسے پڑھنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ داخلہ لینے کی بجائے وہ اپنے شہر کی کبڈی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد اس کی ٹیم کا گجرات کی ٹیم سے گجرات میں مقابلہ ہونا تھا جس کے مہمانِ خصوصی وزیر بلدیات پنجاب تھے۔

وہ اپنی ٹیم کے ساتھ ہر روز پریکٹس کرنے لگا۔ جمعہ کے روز پریکٹس کے بعد وہ ذرا تفریحِ طبع کے لئے دریا کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ڈھلان شروع ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک حسینہ خوب صورت کپڑے پہنے سر پر مٹکا اٹھائے، خراماں خراماں دریا کی طرف جا رہی ہے۔ قمر کے من میں عورت ذات کے پیار کے دیپ جل اٹھے۔ اس نے بھی اپنی رفتار حسینہ کی رفتار کے مطابق ایڈجسٹ کر لی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے جسم کے زیر و بم کو دیکھ کر اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ہونٹ ہلنے لگے لیکن آواز نہ نکلی.... چلتے چلتے اس کے ہوش و حواس نے ساتھ چھوڑ دیا تو وہ راستے میں پڑے ہوئے ایک بڑے سنگ سے ٹکرا گیا۔ درد کے مارے اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔

حسینہ نے آہ سن کر پیچھے دیکھا تو اس کو ایک خوبرو جوان گرا ہوا نظر آیا۔ وہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے خون فوارے کی طرح نکل رہا ہے۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"ہائے اللہ.... بے چارے کا خون بری طرح نکل رہا ہے۔"

اس نے فوراً مٹکا نیچے رکھا۔ اپنے آنچل کو پھاڑا اور قمر کے زخم پر پٹی باندھنے لگی۔ جبکہ قمر آنکھوں میں شادمانی کے موتی سجائے حسینہ کو دیکھنے لگا۔ پٹی باندھنے کے بعد جب حسینہ کی

نگاہ اوپر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ لجا گئی۔

وہ شرماتے ہوئے بولی "آپ مجھے ٹکر ٹکر کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ تم نے اپنے حسنِ عمل سے میرے دل کو زیر کر لیا ہے۔"

"آپ کا کہنا بجا ہے لیکن آپ کا حسنِ عمل تو ٹھیک نہیں ہے.... ایک غیر لڑکی سے پیار کی پینگیں بڑھانا دینی اور رسمی دونوں لحاظ سے اچھا نہیں ہے۔"

"افوہ۔ حسینہ تم نے تو اپنے فطری حسن و گفتگو سے مجھے گھائل کر دیا ہے.... میں تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں فرحت و طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی تاب دار زلفوں کے سائے تلے ذرا سستانے دو۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حسینہ ہی تو ہے" حسینہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"او.. میں مرجاواں۔ تم واقعی حسینہ ہو' تمہارا نام بھی حسینہ ہے" قمر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"پر میں بھی جانوں' آپ کا نام کیا ہے.... ذرا اپنا نام بھی بتائیں" حسینہ نے نچلے ہونٹ کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں قمر ہوں.... میرا نام بھی قمر ہے۔"

"آہا.... اللہ نے کیا جوڑی بنائی ہے۔ ایک حسینہ ہے اس کا نام بھی حسینہ ہے' ایک قمر ہے اور اس کا نام بھی قمر ہے۔ واہ قمر واہ' کیا آپ وہ قمر..... قمر ہیں.... کبڈی ٹیم کے کیپٹن۔ اسکول کی کبڈی ٹیم کے کیپٹن" حسینہ نے بے ساختہ کہا۔

"لیکن تم کیسے جانتی ہو؟" قمر نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"میرا بھائی اکثر آپ کی تعریفوں کے پل باندھتا رہتا ہے۔"

"تمہارے بھائی کا نام کیا ہے؟"

"میرے بھائی کا نام شمس ہے۔"

"آہا۔ آپ شیخ خورشید صاحب کی بیٹی ہیں۔"

"چلو ہٹو۔ بے شرم نہ بنو۔ اپنا راستہ لو.... میں ابھی پتن جا رہی ہوں۔ وہاں اپنی

سہیلیوں کے ساتھ کپڑے دھوؤں گی اور واپسی میں پانی کی گاگر بھی بھرلاؤں گی" حسینہ نے آنکھوں میں جگنو سجا کر کہا۔

حسینہ کی شیریں گفتگو سن کر قمر کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا..... اس نے اپنے تازہ زخم کی قطعی پروا نہ کی اور دیوانہ وار مردانہ گھاٹ کی طرف چل پڑا۔

دریا کے کنارے پہنچتے ہی اس نے کپڑوں سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی اور دریا کی مخالف سمت تیرنے لگا۔ تیرتے تیرتے تھوڑی دور گیا ہو گا کہ اسے حسینہ اکیلے میں پتن کی سیڑھیوں پر بیٹھی کپڑے دھوتی نظر آئی۔ اس نے ایک لمبی ڈبکی لگائی اور اپنا سر عین اس کے سامنے جا کر نکالا۔ حسینہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"قمر۔ خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آجائے گی۔ خدا کے لئے۔"

حسینہ کو دست بستہ دیکھ کر اس کے دل کا جل ترنگ بج اٹھا۔ اس نے شوخ نظروں سے سلام محبت کہا اور ڈبکی لگا کر اپنے پتن کی طرف آگیا۔

حسینہ کا بھائی شمس' قمر کا قدردان تھا۔ پھر قمر نے بھی اس سے اپنے تعلقات استوار کر لئے اور اپنی محبوبہ کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ تب ان کی محبوب محبت رنگ لائی۔ ان کے گھر والوں کے مراسم بھی گہرے ہو گئے اور دونوں کی ماؤں میں بھی میل جول شروع ہو گیا۔ کبھی کبھار حسینہ بھی اپنی ماں کے ساتھ قمر کے گھر آجاتی۔ لیکن قمر گھر میں مورکھ بنا رہتا۔ وہ اپنے گھر میں بھولے سے بھی حسینہ یا اس کی ماں سے بات نہ کرتا۔

پروگرام کے مطابق بروز جمعہ گورنمنٹ ہائی اسکول گجرات کے فٹ بال گراؤنڈ پر گجرات اور قمر کے شہر پنڈ دادن خان کی کبڈی ٹیم کے درمیان مقابلہ ہوا۔ لاہور سے اس کا بھائی آفتاب بھی مقابلہ دیکھنے آیا تھا۔ دونوں ٹیموں کا پلہ برابر تھا۔ قمر نے اپنے آخری میچ میں بے مثال مہارت کا مظاہرہ کر کے اپنی ٹیم کو ظفرمندی سے ہمکنار کیا۔ تماشائی اس کے کھیل کو دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ وزیر بلدیات نے قمر کو خصوصی انعام سے نوازا۔

آفتاب اپنے بھائی کے کھیل کے جوہر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ خوشیوں سے سرشار

اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لاہور لے آیا۔ قمر جب تیز گام ٹرین سے لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا تو اس نے جگہ جگہ قدِ آدم پوسٹرز لگے دیکھے۔

"جوائن دی نیوی اینڈ سی دا ورلڈ۔" (نیوی میں بھرتی ہو کر دنیا جہاں کی سیر کریں)

قمر کو دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اب قدرت نے اسے دنیا دیکھنے کا سنہری موقع فراہم کر دیا تو وہ بھائی کو بتائے بغیر دوسرے روز نیوی ریکروٹنگ سنٹر پہنچ گیا۔

قمر چودھویں کا چاند تھا۔ وجیہہ تھا' سینہ چوڑا چکلا' دراز قد اور سڈول جسم۔ ایک روز پہلے ہی وہ اپنی بہادری کا کارنامہ دکھا چکا تھا۔ پھر نہلے پر دہلا اس کبڈی میچ کو کیپٹن باسط نے بھی دیکھا تھا۔ وہ ریکروٹنگ آفیسر تھا۔ لہٰذا قمر کو نیوی میں بھرتی ہونے میں ذرا مشکل پیش نہ آئی۔ بلکہ کیپٹن باسط تو الٹا اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

"ویل ڈن قمر' ملک کو تم جیسے چاق و چوبند جوانوں کی ضرورت ہے۔"

قمر کو وسط جون میں ٹریننگ اسٹیبلشمنٹ کراچی رپورٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ بحری جہاز کے عملے میں شامل ہونے سے پہلے اس نے ٹریننگ سنٹر میں لگ بھگ ڈیڑھ سال کا ٹریننگ کورس کرنا تھا۔

کراچی جانے کے لئے چند دن ہی باقی رہ گئے تھے تو قمر نے نیوی میں بھرتی ہونے کے متعلق آفتاب بھائی کو بتا دیا۔ آفتاب سن کر بہت ناراض ہوا۔

"قمر' تم نے نیوی میں بھرتی ہو کر اچھا نہیں کیا۔ تم نے ابو کی خواہش کا رتی بھر پاس نہیں کیا۔ وہ تمہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے اور تم نوکر ہو گئے ہو.... میں ابو کو کیا جواب دوں گا۔"

قمر روہانسا ہو کر بولا "بھائی جان۔ مجھ میں انجینئر بننے کی اہلیت نہیں۔ میں سخت کند ذہن ہوں' پڑھائی میرے لئے کسی روگ سے کم نہیں۔ آپ لوگ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ میں سہار نہ سکوں۔"

قمر کی وزنی دکھی بات سن کر آفتاب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "ٹھیک ہے قمر۔ جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن ابھی تم امی ابو سے ملے بغیر چلے جاؤ۔ اگر تم ان سے ملنے گئے تو پھر وہ کبھی بھی تمہیں کراچی نہیں جانے دیں گے اور تم اپنے خوابوں کی تعبیر سے محروم رہ جاؤ گے۔"

پھر قمر نے تمکنت کے ساتھ ٹریننگ سنٹر رپورٹ کر دی اور ماہ و سال اپنی رفتار سے گزرنے لگے۔

دورانِ ٹریننگ اس کی زندگی میں ایک بھیانک حادثے نے کروٹ لی۔ اسے اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے چھٹی لے کر آنے کے لئے کہا گیا۔ جب وہ چھٹی لے کر گھر پہنچا تو اس پر یہ عقدہ کھلا کہ آفتاب کی شادی اس کی اپنی محبوبہ حسینہ سے ہو رہی ہے۔ اس پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ رہ رہ کر کفِ افسوس ملنے لگا کہ اس نے اپنے والدین کو حسینہ سے اپنی محبت کے بارے میں آگاہ کیوں نہ کیا۔ اگر وہ ان پر اپنے پیار کا راز منکشف کر دیتا تو آج اسے یہ منحوس دن نہ دیکھنا پڑتا۔

قمر مغموم رہنے لگا۔ چند دنوں کے اندر اس کا گلابی چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا۔ ماں باپ اور بھائی اس کو پریشان دیکھ کر فکر مند رہنے لگے۔ انہوں نے باری باری اس سے مغموم و مضمحل رہنے کی وجہ پوچھی لیکن کسی کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

ایک روز آفتاب اس کے پاس آیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور قمر کے پاس بستر پر بیٹھ کر غمگین لہجے میں گویا ہوا "میرے پیارے بھائی' ہم سب تمہیں اداس دیکھ کر پراگندہ ہیں۔ عجیب مخمصے میں گرفتار ہیں اور سوچ سوچ کر پاگل ہو رہے ہیں کہ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ تمہارے بڑے بھائی کی شادی ہو رہی ہے.... لیکن خوش ہونے کے بجائے تم اپنے آپ کو کھائے جا رہے ہو؟" آفتاب نے پیار سے بھائی کی پیشانی کو چوما اور تشفی دیتے ہوئے کہا "تم مجھے اپنا دوست سمجھو اور مجھے اپنے دل کا وہ راز بتا دو جو دھیرے دھیرے تمہارے وجود کو ختم کر رہا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے راز کو فاش نہیں کروں گا اور تمہاری خوشی کی خاطر ساغرِ سم بھی پی لوں گا۔"

"بھائی جان.... بھائی۔"

"ہاں' ہاں۔ بولو بھائی..... پلیز۔"

قمر کی آنکھوں میں اشکوں نے ڈیرا جمالیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا بولا "بھائی جان.... میں اور.... میں اور حسینہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔"

قمر کے زہریلے انکشاف پر آفتاب کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ لیکن آناً فاناً اس نے دل کو سنبھال لیا۔ وہ جرات وجاہت کا لبادہ اوڑھ کر بولا۔ "میرے بھائی۔ خوشی کے شادیانے بجاؤ' حسینہ تمہاری ہے.... تمہاری ہے' صرف تمہاری۔"

○☆○

ایک دن موقع کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آفتاب ناشتے کی میز پر اپنے والدین سے محوِ گفتگو ہوا۔

"امی اور ابو۔"

"ہاں بیٹا؟"

"میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

بیٹے کی بات سنتے ہی ان دونوں کے قلوب میں بھونچال آگیا۔ دونوں لرزتے ہوئے یکدم بولے۔

"کیوں بیٹا؟"

"اس لئے کہ مجھے شادی سے نفرت ہے۔"

ماں بلائیں لیتے ہوئے بولی "بیٹا۔ ایسا نہ کہو' ہمارے روشن دلوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرا مت بکھیرو.... ہر ماں باپ کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت سی دلہن بیاہ کر لائیں جو اپنی چمک دمک سے ان کے آنگن میں اجالا بکھیر دے۔ بیٹا خدا کے لئے ہمیں اپنے حق سے محروم نہ کرو۔"

اپنے والدین کو آزردہ دیکھ کر آفتاب اپنے دل کو مسوس کر رہ گیا۔ وہ شکستہ دل سے بولا۔

"ماں' قمر جو ہے' قمر کے سر پر سہرا سجا کر آنگن کو منور کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن بیٹا' حسینہ تو تمہاری منگیتر ہے۔ حسینہ اور اس کے والدین بھلا قمر کو کیسے بیٹا بنانے پر راضی ہوں گے۔"

"امی جان۔ آپ یہ کام مجھ پر چھوڑیں۔"

مرتا کیا نہ کرتا' ماں باپ نے اپنے ضدی بیٹے کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

دوسرے دن آفتاب حسینہ کے گھر گیا۔ اس کی امی نے دروازہ کھولتے ہی بڑے چاہت

بھرے انداز میں کہا "آہا! بیٹا آفتاب.... آؤ آؤ بیٹا.... اندر آؤ۔"

پھر وہ اسے خوشی خوشی اندر لے آئی اور اسے نشست گاہ کے صوفے پر بٹھا کر بولی۔

"بیٹا۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی۔ چائے وغیرہ کا تکلف نہ کریں۔ مجھے ذرا جلدی ہے' پہلے میری بات سن لیں۔"

"ہاں' بیٹا' کیا بات ہے؟"

"میں..... میں۔"

"ہاں' بیٹا بولو تو سہی کیا بات ہے؟"

"آنٹی۔ آپ میری دلسوز بات سن نہ پائیں گی۔"

"لیکن بیٹا' بات تو سننی ہی پڑے گی۔"

"آنٹی۔ بات یہ ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے نہیں کہ حسینہ مجھے پسند نہیں ہے یا حسینہ نے کوئی جرم کیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اب مجھے شادی سے نفرت ہو گئی ہے ..... شدید نفرت۔"

آفتاب کا زہریلا انکشاف سنتے ہی حسینہ کی ماں کی اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی خوشیوں پر اوس کی چادر تن گئی۔ وہ غم زدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ "آفتاب۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں شادی سے نفرت کیوں ہو گئی ہے.... اگر تم نے شادی نہیں کرنی تھی تو حسینہ سے منگنی پر کیوں راضی ہوئے تھے۔"

آنٹی کے چبھتے سوال نے آفتاب کو لمحہ بھر کے لئے پریشان کر دیا' پھر وہ ہمت کر کے بولا۔

"آنٹی' مجھے عورت ذات سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ کپتان فیروز کی بیوی اور وہ بھی چار بچوں کی ماں' ایک چھوٹی حیثیت کے مرد کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"تو بیٹا۔ پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ اگر ایک عورت نے مذموم فعل کیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر عورت خراب ہے۔ تم کسی غیر عورت کی سزا حسینہ کو کیوں دینا چاہتے ہو' کیوں؟"

"آنٹی' میری مجال کہاں کہ میں حسینہ جیسی فرشتہ صفت لڑکی کو سزا دوں۔"

"لیکن حسینہ کی عزت کا سوال ہے۔ وہ تمہاری منگیتر ہے' منگنی ٹوٹ جانے پر لوگ اس کی عفت و عصمت پر شک کریں گے۔ پھر اس سے کوئی بھی شادی کرنے پر تیار نہیں ہو گا۔ اس طرح حسینہ کبھی بھی اپنی مانگ میں شادی کا سندور نہ لگا سکے گی۔"

"آنٹی ایسا نہ کہو.... میں حسینہ کو قمر کے لئے پروپوز کرتا ہوں۔ اور قمر بھی حسینہ کو اپنی آنکھوں کا کاجل بنانے کے لئے تیار ہے۔"

"کیا ... کیا کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کسٹم آفیسر کی منگیتر ایک معمولی سپاہی سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے" حسینہ کی ماں لال سرخ ہو کر بولی۔

آفتاب برجستہ بولا "قمر سپاہی ضرور ہے لیکن حسینہ کے دل کا شہزادہ ہے... دل کا شہزادہ' پھر وہ اسم بامسمّٰی ہے' چاند ہے چاند۔" پھر وہ لقمہ دیتے ہوئے مزید بولا "ذرا حسینہ سے پوچھ کر تو دیکھئے' قمر چاند ہے کہ نہیں؟"

"لیکن تم بھی تو سورج ہو' سورج.... اور سورج کے آگے چاند کی کیا حیثیت!" حسینہ کی ماں نے تمسخرانہ انداز اختیار کیا۔

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی تو آفتاب حسینہ کو دیکھ کر بولا "لو مقدر کی شہزادی آ گئی ہے.... ذرا ان محترمہ سے پوچھ لیجئے۔"

"کیوں حسینہ' کیا تم قمر سے محبت کرتی ہو؟" ماں نے اشکبار آنکھوں سے بیٹی سے سوال کیا۔

"ہاں ماں' ہاں ہم دونوں پور پور ایک دوسرے کی محبت میں غریق ہیں" حسینہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"بیٹا آفتاب۔ کیا تمہارے والدین حسینہ کو بہو بنانے پر تیار ہو جائیں گے؟" حسینہ کی ماں نے بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آفتاب سے پوچھا۔

"آنٹی' وہ تو اپنے بیٹوں کی خوشیوں کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہیں" آفتاب باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ حسینہ کی ماں نے بھی بیٹی کی خوشی کی خاطر اپنے کمزور سینے پر سل رکھ لی

اور حسینہ کی شادی قمر سے کردی۔

شادی کے چند ماہ بعد قمر کی ٹریننگ ختم ہوگئی اور اس کا جہاز میں تبادلہ ہوگیا۔ تب وہ مقام بھی آگیا جس کے لئے قمر نے نیوی جوائن کی تھی' یعنی جوائن دی نیوی اینڈ سی دا ورلڈ۔

○☆○

اس نے جہاز پر رپورٹ کی اور جہاز اگلے ہی ہفتے سری لنکا' تھائی لینڈ' انڈونیشیا' سنگاپور' فلپائن اور ہانگ کانگ کے خیرسگالی دورے پر روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے جہاز کولمبو پہنچا۔ قمر نے جب سری لنکا کے حسین نظاروں کو دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ٹرنکومالی کا شہر بھی اسے خاصا پسند آیا۔

سری لنکا سے اس کا جہاز سنگاپور پہنچا۔ سنگاپور کے حسین شہر اور وہاں کی چھوٹے قد کی حسین شہزادیوں کو دیکھ کر اس کا دل بھی حسین ہوگیا۔ اس نے نیفی میں جاکر زندگی میں پہلی دفعہ شراب پی۔ شراب پینے کے بعد اس نے نیفی کی کال گرل مارلن کے ساتھ رقص کیا اور جام سے جام ٹکرایا۔

یہ حسین شہر سنگاپور میں حسین شہزادے قمر کا پہلا دن تھا۔ پھر دوسرے دن بھی رقص ہوا اور رقص کے بعد اس نے اپنی زندگی میں رعنا رقاصہ مارلن کی محبت کو اپنے دل میں اتار لیا۔ ڈانس کا وقت ختم ہونے تک وہ نیفی میں بیٹھا رہا اور شراب پیتا رہا۔ بعد میں وہ مارلن سے ملا اور شراب میں مخمور ہوکر اس سے پیار کا اظہار کیا۔

مارلن کا تو یہ طرۂ امتیاز تھا کہ وہ بے وقوف قسم کے بے راہ رو کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کرکے اپنے گھر میں لاتی' اس سے بھاری رقم وصول کرتی اور اس کے عوض اپنے جسم کی خوب صورت چمک دمک سے اس کے مَن کو سیراب کرتی۔

قمر سے بھی اس نے ویسا ہی سلوک کیا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گئی اور اس سے ایک سو سنگاپوری ڈالر لے کر اس کی آرزو کو پورا کیا۔

قمر چونکہ شراب میں مست تھا اس لئے مارلن نے ہوش میں آنے تک اسے اپنے گھر میں ہی رکھا پھر کار میں بٹھا کر بندرگاہ پر چھوڑ گئی۔ گڈنائٹ کرنے سے قبل وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے گویا ہوئی۔

"قمر۔ کل تو اتوار ہے۔ تمہیں بھی چھٹی ہے... اگر کہو تو کل صبح دس بجے آ کر میں تمہیں پک کرلوں اور سنگاپور کی سیروسیاحت کراؤں۔"

"یس مارلن۔ کل ضرور آنا۔ بادولت دلفریب رنگوں اور کیف آور نظاروں سے سجے سنگاپور کو ضرور دیکھیں گے" قمر نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"او کے۔ گڈ نائٹ قمر۔"

"گڈ نائٹ مارلن۔"

دوسرے دن مارلن نے قمر کو سنگاپور کی جی بھر کر سیر کرائی۔ سب سے پہلے وہ قمر کو سنگاپور کے چڑیا گھر لے گئی۔ وہ دنیا کے عمدہ ترین چڑیا گھروں میں سے ایک ہے جو ۹۰ ہیکٹر پر مشتمل ایک پُرسکون سرسبز و شاداب اور خوب صورت قطعۂ اراضی پر واقع ہے۔ اس میں سولہ سو سے زائد جانور ہیں جن میں بہت سی نایاب نسلیں ہیں۔ قطبی ریچھ کا تماشا اس چڑیا گھر کا خاص آئٹم ہے۔

پھر وہ اسے برڈ پارک لے گئی جو دنیا بھر میں سب سے بڑا پارک ہے۔ ۲۰ ہیکٹر رقبے پر پھیلے ہوئے برڈ پارک میں تین سو سے زائد قسموں کے لگ بھگ تین ہزار پرندے ہیں۔

دوسرے روز وہ اسے تفریحی جزیرے سینٹوسا پر لے گئی۔ اس جزیرے پر موسیقی والے فوارے ' تتلیوں کے پارک ' متعدد عجائب گھر اور دیگر تفریحات قمر جیسے سیاحوں کے لئے قابلِ کشش تھے۔ جسے دیکھ کر قمر بہت محظوظ ہوا۔

آخر میں مارلن اسے شاپنگ کے مقامات پر لے گئی۔ کیونکہ اسے بھی قمر کے پیسوں پر شاپنگ کرنی تھی۔ وہ اسے آرچرڈ روڈ کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز اور فیشن ایبل بوتیک ' لٹل انڈیا ' عرب اسٹریٹ ' ہالینڈ روڈ شاپنگ سینٹر ' ٹینگلسن شاپنگ سینٹر ' پینی سولا شاپنگ سینٹر ' ریفلز سٹی اور میرینا اسکوائر وغیرہ لے گئی اور قیمتی قیمتی اشیاء خرید کر اس کی جیب کا صفایا کر دیا۔

قمر سنگاپور جتنے دن بھی رہا خوب رنگ رلیاں مناتا رہا۔ وہ رات کو نیفی میں جاتا۔ خوب شراب پیتا اور مارلن کے ساتھ ڈانس کرتا۔ پھر وہ اس کے گھر آتا اور اس کے رنگ و نور سے

فیض یاب ہوتا۔ قمر کو اس عنصر کی قطعی پروا نہ تھی کہ پاکستان میں اس کی منکوحہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور وہ غیر دیس میں غیر اسلامی افعال کا ارتکاب کر رہا تھا۔ اس نے تو اپنے اوپر بے حیائی کا خول چڑھا لیا تھا۔ وہ فخریہ انداز میں اپنے دوستوں کو اپنے گھٹیا کرتوتوں کی کہانیاں سناتا۔

سنگاپور سے وہ دوسرے آفیسرز و سیلرز کے ساتھ ملائشیا گیا۔ وہ کوچ میں بیٹھ کر اسلامی ملک ملائشیا کے دارالخلافہ کوالالمپور گئے ' وہاں کے پاکستانی سفیر نے جو ایک معروف ریٹائرڈ جنرل تھے ' ان لوگوں کے لئے ایک پُرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ ملائشیا جانے کے لئے صرف ایک پل کو عبور کرنا پڑتا ہے جو آبنائے جوہور پر بنایا گیا ہے۔ سنگاپور کا رقبہ صرف ۲۲۴ مربع میل ہے۔ دراصل سنگاپور ملائشیا کا ہی حصہ تھا لیکن انگریزوں نے سنگاپور کو ایک الگ ملک بنا دیا کیونکہ وہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔

سفیرِ پاکستان نے اس پُرتکلف تقریب میں مختصر مگر پُراثر تقریر بھی کی اور اپنے ہم وطنوں کو تشکر و توصیف سے پرویا ہوا ہار پہنایا اور اپنی خطابت کے بعد انہیں کھانے کی لذیذ ڈشوں سے انجوائے کرنے کی دعوت دی۔ سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ بعد میں سیلرز کو کوالالمپور کی سیر کرائی گئی۔ اس وقت کوالالمپور کی آبادی تقریباً ۹۴ لاکھ تھی۔ ملائشیا کا کل رقبہ ۱۲۷ ہزار ۳۱۶ مربع میل ہے۔

رات کے پچھلے پہر نیول جہاز کا عملہ سنگاپور پہنچ گیا جہاں ان کا جہاز کھڑا تھا۔ قمر کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ وہ ملائشیا میں نازنینوں کے حسن سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ وہ بھی صرف آدھا دن اور پھر پرائیویسی بھی نہ تھی کیونکہ جہاز کا پورا عملہ ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔

سنگاپور کے بعد قمر کا جہاز تھائی لینڈ کے صدر مقام بنکاک پہنچا۔ تھائی لینڈ کا کُل رقبہ ۱۹۸' ۴۵۶ مربع میل ہے۔ اس وقت تھائی لینڈ کی آبادی تقریباً ساڑھے چار کروڑ اور بنکاک کی آبادی ۳۱ لاکھ تھی۔ تھائی لینڈ کی ۹۵ فیصد آبادی بدھ ازم سے تعلق رکھتی ہے۔

جونہی جہاز بنکاک کی خوب صورت بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا ' قمر اپنے دوست راشد کے

ساتھ بنکاک کی سیر کو چل نکلا۔ انہوں نے بنکاک کے مشہور تفریحی مقامات نیشنل میوزیم' کروکوڈائل پارک' گرینڈ پیلس اور ٹمپل آف بدھا کو دیکھا۔ بدّھا کا مندر بدھوں کی معروف بڑی عبادت گاہ ہے جس میں بدھا کا سونے کا بت رکھا ہے۔ قمر نے بنکاک کے حسین نظاروں کے ساتھ ساتھ حسین شہزادیوں کو بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ سحر انگیز بجلیاں تو قمر کی کمزوریاں تھیں جو اس کے خون کی گردش تیز کر دیتی تھیں۔

جب اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی' آنکھ کسی دیوی کے دیدار کے لئے ترسنے لگی اور دل کی حالت بگڑنے لگی تو وہ مجبوراً اس سندر راہ پر چل پڑا جو جلوہ گاہ میں جاتا تھا۔ جہاں معاشرے کو بگاڑنے والیاں اپنے دلربا اجسام کی کرنوں سے حسن کے سوداگروں کو منور کرتی تھیں۔ پھر قمر رنگوں کی آماجگاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں وہ باری باری ہر کمرے میں گیا۔ ہر جھلملاتے کمرے میں کپڑوں سے مبرا دمکتی و چمکتی پریوں سے باتیں کیں۔ ان حسیناؤں کے حقیقی جلوے سے سیراب ہونے کا ریٹ قمر کی بساط سے زیادہ تھا لہٰذا بے چارہ نامراد واپس لوٹ آیا۔

جگمگاتے علاقے سے واپس آتے ہوئے جب اس کی نظر ایک نیم برہنہ نازنین پر پڑی تو وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ راشد نے اسے بہت سمجھایا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"ارے احمق قمر.... یہاں سے ہزاروں کلومیٹر دور تیری اپنی شریکِ حیات تیرے انتظار میں گن گن کر لیل و نہار گزار رہی ہے اور تو یہاں عیاشی کے پرپرزے نکال رہا ہے۔ بے وقوف شرم کر' اگر بھولے سے وہ بھی تیری طرح پُرخار راستے پر چل پڑی تو پھر تیرے دل پر کیا گزرے گی۔ کیا تو اسے معاف کر دے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ تو اسے قتل کر دے گا یا طلاق دے دے گا۔"

لیکن قمر تو اندھا ہو چکا تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اندھے پن میں' خراماں خراماں چلتی ماہ جبین کے پیچھے چل پڑا۔

نازک اندام لڑکی نے جب ایک دل پھینک جوان کو فالو کرتے دیکھا تو ناگاہ وہ اپنے خوب صورت جسم کو جھٹک کر مڑی' کافرانہ اداؤں سے قمر کو دیکھا اور لبوں پر مخمور تبسم سجائے گویا

ہوئی "ہیلو۔"

"یس بیوٹی فل گرل۔"

"وائی آر یو فالوئنگ می؟" (تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو)

"بی کاز آئی لائیک یو۔" (اس لئے کہ میں تم کو پسند کرنے لگا ہوں)

"او۔ آئی سی' ویلکم۔" (میں سمجھی' میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔)

"ریٹ پلیز۔"

"اونلی ہنڈرڈ بھات۔" (صرف سو بھات)

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"اٹریکٹو تھنگ اِز آل ویز پریشس۔" (دلربا چیز کی قیمت ہمیشہ زیادہ ہی ہوتی ہے)

"لیکن میرے پاس تو صرف ستر بھات ہیں۔"

"بقیہ رقم اپنے دوست سے مانگ لو۔"

"او کے۔ ڈارلنگ۔"

لیکن راشد نے ترت انکار کر دیا "میں اس مذموم و گھناؤنے فعل کے ارتکاب کے لئے تمہیں ایک دمڑی بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

قمر نے ہزار جتن کئے لیکن بے سود۔ وہ منہ لٹکا کر گوری چمڑی والی کے پاس آیا اور منہ بسور کر بولا۔

"ویری ساری ڈارلنگ۔"

"بٹ وائی۔" (مگر کیوں)

"اس لئے کہ میرا نامعقول دوست اس برے کام کے لئے میری مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

"او' نو۔ اٹ از ناٹ بیڈ۔" (نہیں یہ ہرگز برا فعل نہیں ہے)

"لیکن اس کے نزدیک یہ گناہ ہے..... گناہ۔"

"او' نو دِس اِز ناٹ سِن' دِس اِز انجوائے منٹ۔" (نہیں یہ گناہ نہیں ہے۔ یہ تو تسکین

قلب ہے)

"ڈارلنگ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو' لیکن کیا یہ انجوائے منٹ سترّبھات میں نہیں ہو سکتی' کیا تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ سکتیں۔ پلیز میری مدد کرو' اگر میں تم سے یہ فرحت انگیز کھیل نہ کھیل سکا تو پھر میں مرجاؤں گا' مرجاؤں گا۔"

"او کے ڈارلنگ' آئی ایگری۔" (ٹھیک ہے' مجھے منظور ہے)

پھر وہ نازک اندام مہوش ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اسے اپنے گھر میں لے آئی۔ راشد کے سامنے سٹنگ روم میں ہی وہ کپڑے اتار کر ننگِ آدم بن گئی۔ اس کا ننگ دھڑنگ روپ اختیار کرنے کا مقصد بھی گھناؤنا تھا۔ وہ اپنے مرمریں جسم کی رنگینیوں سے راشد کے دل کو بھی اپنی مٹھی میں لینا چاہتی تھی لیکن راشد تو پتھر تھا' پکا مسلمان۔

وہ قمر کو لے کر ملحقہ کمرے میں گھس گئی اور راشد ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنے شادی شدہ دوست کی کارستانی پر کڑھتا رہا۔ پھر قمر نے جب حسینہ کے حسن سے دل کو سیراب کرلیا تو وہ دونوں باہر آگئے اور جہاز پر پہنچنے کے لئے بس کا انتظار کرنے لگے۔ پلک جھپکنے میں بس آگئی۔ بس میں قمر کو سیٹ ایک عورت کے ساتھ ملی جبکہ راشد پچھلی سیٹ پر ایک باریش آدمی کے پاس بیٹھ گیا۔

بنکاک میں خواتین و حضرات اکٹھے ہی سفر کرتے ہیں۔ بس میں عورتوں کے لئے مخصوص نشستیں نہیں ہوتیں۔ ان کو بیٹھے تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ قمر کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے تڑاخ سے طمانچہ قمر کے منہ پر مارا۔ راشد نے لپک کر قمر کو عورت کی آہنی گرفت سے چھڑالیا۔

"پلیز۔ میڈم فارگو ہم۔" (میڈم اسے معاف کردو۔)

جہاز کے ڈیک پر قدم رکھتے ہی راشد نے تجسس سے پوچھا "اس عورت نے تمہیں تھپڑ کیوں مارا تھا؟"

"یار مجھے وہ حسینہ پسند آگئی تھی۔ میں نے چپکے سے اس کی چٹکی لے لی تھی۔ پھر اس نے میرے گال کو لال کردیا۔"

بنکاک میں قمر نے چار دن گزارے۔ وہ چار دن اس کے لئے عید کے دن ثابت ہوئے۔ اس نے وہاں خوب عیش و عشرت کے چڑے اڑائے۔

بنکاک سے قمر کا جہاز فلپائن کے دارالخلافہ منیلا پہنچا۔ فلپائن کا رقبہ ۱۱۶ ہزار مربع میل ہے جو تقریباً ۷۱۰۰ (سات ہزار ایک سو) جزائر پر مشتمل ہے۔ اس وقت فلپائن کی آبادی ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ اور منیلا کی ۱۶ لاکھ تھی۔ اب فلپائن کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ اور منیلا کی ۸۰ لاکھ ہے۔

منیلا بہت ہی خوب صورت شہر ہے۔ دریائے پاسگ منیلا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے بیچوں بیچ بل کھاتا منیلا کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا منیلا بے میں گرتا ہے۔ خلیجِ منیلا کا رقبہ تقریباً ۷۷۰ مربع میل ہے اور یہ دنیا کی بہترین قدرتی بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ منیلا کا نیشنل پارک بھی بے نظیر نظارہ پیش کرتا ہے۔

قمر نے سب سے پہلے نیشنل پارک کو دیکھا۔ وہیں ایک ادھیڑ عمر عورت سے اس کا سامنا ہوگیا۔ وہ کولہے مٹکاتے ہوئے بولی "ہیلو سویٹی بوائے 'گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ" قمر نے بھی خوش کن لہجے میں کہا۔

"آر یو پاکستانی؟" (کیا تم پاکستانی ہو)

"یس' آئی ایم پاکستانی۔" (ہاں میں پاکستانی ہوں)

"اِف یو وانٹ می' فالو می۔" (اگر تم مجھ سے انجوائے کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ)

"نو میڈم' نو۔"

"کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے؟" اس نے مسکراتے ہوئے انگلش میں کہا۔

"یس میڈم.... تمہاری عمر بہت زیادہ ہے۔"

"او کے۔ میرے گھر چلو۔ میری خوب صورت بیٹی تمہارے من میں خوشیوں کے دیپ روشن کردے گی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

پھر وہ اس کے ساتھ چل دیا اور اس کے گھر پہنچ کر اس کی بیٹی کے اجالے سے اپنے من

کی انگنائی کو فروزاں کیا۔ وہ ہفتہ بھر منیلا میں رہا اور عیاشی کرتا رہا۔

منیلا سے اس کا جہاز انڈونیشیا کے دارالخلافہ جکارتا گیا۔ جمہوریہ انڈونیشیا مسلمان ملک ہے۔ یہ بحرالکاہل اور بحرِ ہند کے درمیان پھیلے ہوئے ۱۳۰۰۷ (تیرہ ہزار سات سو جزائر) پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ ۷ لاکھ ۳۵ ہزار ۳ سو اٹھاون میل ہے۔ اس کے معروف جزیروں کے نام جاوا، ساٹرا، بورنیو، نیوگنی، سیلیبز اور مدورا ہیں۔

اس وقت انڈونیشیا کی آبادی ۱۵ کروڑ اور جکارتا کی ۶۵ لاکھ تھی۔ انڈونیشیا کی کُل آبادی کا ۶۰ فیصد دو جزائر جاوا اور مدورا میں رہتا ہے۔ معدنیات خصوصاً المونیم، نکل، کاپر اور کول بہتات میں ملتا ہے، خام تیل اور قدرتی گیس دنیا میں سب سے زیادہ یہیں سے نکلتی ہے۔

انڈونیشیا ۱۹۴۹ء میں آزاد ہوا۔ یہ اکلوتا ملک ہے جس نے ۱۹۶۵ء میں اقوامِ متحدہ کی رکنیت ختم کردی تھی اس لئے کہ اقوام متحدہ نے ملائشیا کو اپنی تنظیم کا رکن بنالیا تھا جبکہ انڈونیشیا اسے اپنے ملک کا حصہ سمجھتا تھا۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اس کا ملائشیا کے ساتھ امن معاہدہ ہوگیا اور اس نے دوبارہ یو این او جوائن کرلی۔

ملائشیا ۱۹۶۳ء میں انڈونیشیا سے الگ ہوا تھا اور اس وقت سے انڈونیشیا نے اس کے ساتھ گوریلا لڑائی شروع کررکھی تھی۔

جکارتا میں بھی قمر نے اپنے شغل کو جاری رکھا۔ وہاں کی رنگینیوں اور سحر طرازیوں سے خوب انجوائے کیا۔

قمر کا جہاز ہانگ کانگ بھی گیا جس کی بندرگاہ پر ہمہ وقت کشتیوں اور انواع واقسام کے جہازوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ہانگ کانگ کو ۱۸۹۸ء میں چین نے ۹۹ سال کے لئے برطانیہ کو پٹے پر دیا تھا۔ ہانگ کانگ ۴۱۳ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے میں جزیرہ ہانگ کانگ، جزیرہ نما کولون اور کئی دیگر چھوٹے چھوٹے جزیرے شامل ہیں۔

یہ دنیا کا گنجان ترین علاقہ ہے۔ اس چھوٹے سے علاقے میں تقریباً ۵۸ لاکھ لوگ رہتے ہیں۔ دنیا بھر کی تجارتی منڈیوں میں ہانگ کانگ گیارہویں نمبر پر ہے۔ یہاں فی کس آمدنی تقریباً

۱۲ ہزار امریکی ڈالر ہے۔ یہاں شراب بکثرت پی جاتی ہے۔ روئے زمین پر کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں ہانگ کانگ کے مقابلے میں فی کس شراب زیادہ پی جاتی ہو۔ یہاں فی ایکڑ رولس رائس گاڑیوں کی تعداد بھی دنیا کے ہر علاقے سے زیادہ ہے۔ لیکن یہاں ایسے لوگ بھی ملیں گے جو کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ مثلاً ۲۶ فوک سون اسٹریٹ میں رہنے والے۔ یہاں لوگ چھوٹے چھوٹے محبوس پنجروں میں رہتے ہیں۔ چھ فٹ طویل، ۳۰ انچ گہرے اور ۳۰ انچ اونچے ان پنجروں کی اوپر تلے تین منزلیں ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر پنجرے کا اوسط ماہانہ کرایہ ۱۵۰ ڈالر ہے۔ معذور اور بے کس افراد کو ہانگ کانگ میں معذوری پنشن بھی دی جاتی ہے جو کہ ۵۰۰ سے ہزار ڈالر کے درمیان ہوتی ہے۔

قمر نے جزیرہ لنٹاؤ بھی دیکھا، جہاں پولین کی بدھ خانقاہ ہے۔ اس میں گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا سونے کا مجسمہ رکھا ہے جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

قمر نے وکٹوریہ جزیرہ بھی دیکھا۔ وہ اسٹار فیری پر وکٹوریہ جزیرے سے کولون جزیرہ بھی گیا۔ کولون جزیرے کا دل ناتھن روڈ ہے۔ اس سڑک کے بارے میں مشہور ہے کہ دنیا بھر کے درزی یہاں جمع ہوگئے ہیں جو ہر وقت ناپ لینے اور کپڑے کاٹنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

لیکن قمر کو ناتھن روڈ کی وہ رنگا رنگ دنیا پسند آئی جہاں دھان پان سی چینی لڑکیاں مساج کرتی تھیں۔ قمر نے بھی ان میں سے ایک لڑکی سے مساج کرایا اور اس کے مرمریں جسم سے اٹھتی ہوئی دلفریب کرنوں سے اپنے ذہن اور من کو فروزاں بھی کیا۔ قمر نے اوشن پارک کو بھی دلچسپی اور خوشی کے ساتھ دیکھا اور ڈولفن کے کھیل کو بہت پسند کیا۔

قمر نے چین کے ساتھ ملنے والی ہانگ کانگ کی ۲۶ میل طویل سرحد پر لگی ہوئی خاردار تاروں کی باڑھ بھی دیکھی۔ وہ باڑھ ۱۹۸۰ء میں لگائی گئی تھی جس کا مقصد شمال سے آنے والے انسانی سیلاب کو روکنا تھا۔ اس زمانے میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ سے زائد چینی تارکینِ وطن ہانگ کانگ پہنچ رہے تھے۔

پھر اس کے جہاز کا خیرسگالی دورہ ختم ہوا اور اس کا جہاز مشرقی پاکستان پہنچا۔ وہاں اس کی

دوستی ایک بلیک بیوٹی کوئین سے ہو گئی۔ وہ جتنے دن مشرقی پاکستان رہا اس نے اس ملکہ کے من جھومر کو اپنے پیا سے من میں سجائے رکھا۔

مشرقی پاکستان سے اس نے اپنے لئے ایک اسکوٹر بھی خریدا تھا کیونکہ اسکوٹر وہاں سستا ملتا تھا۔ اسکوٹر سستا ملنے کی شاید وجہ یہ تھی کہ ایک تو حکومت نے ٹیکسوں پر چھوٹ دے رکھی تھی۔ دوسرے وہاں غربت کی وجہ سے لگژریس اشیاء کی طلب بھی نہ تھی اور معاشیات کے اصول کے مطابق کسی شے کی قیمت کا تعین طلب و رسد پر منحصر ہوتا ہے۔

جونہی مشرقی پاکستان سے قمر کا جہاز ویسٹ وہارف پر لنگر انداز ہوا تو گھر سے اسے تار ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کے گھر میں چاند سے بیٹے نے جنم لیا ہے۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے فی الفور چھٹی منظور کرائی اور گھر پہنچ گیا اور اپنے والدین اور بیوی کی خوشیوں میں شریکِ سفر بن گیا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور وہ مختلف ممالک مصر، جبرالٹر، مالٹا، پرتگال، فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے خیرسگالی دورے کرتا رہا اور وہاں کی دل نشینوں کی سحر طرازیوں و جلوہ سامانیوں سے مستفیض و مسحور ہوتا رہا۔

○☆○

ایک روز قمر کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس میں سے ایک کارڈ زمین پر گر پڑا۔ اس نے اٹھا کر اسے پڑھا۔ اس پر لکھا تھا "عمر خان، پروپرائٹر روماشانہ۔"

قمر کو یاد آیا کہ ایک دفعہ سالانہ چھٹی پر وہ بذریعہ تیز گام گھر جا رہا تھا تو حیدر آباد اسٹیشن پر ایک عمر رسیدہ شخص نے ائرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ سے آواز دی تھی۔

"او بیٹا!"

"جی چاچا جی۔"

"بیٹا، وہ رسائل و کتب کا اسٹال ہے، وہاں سے اخبار لا دینا... پلیز۔"

"اچھا جی۔"

وہ اخبار دینے کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ٹرین چل دی۔ عمر رسیدہ شخص نے پیار سے اسے کہا "بیٹا ادھر ائرکنڈیشنڈ بوگی ہی میں آجاؤ۔ جب گاڑی دوسرے اسٹیشن پر رکے گی تو اپنے کمپارٹمنٹ میں چلے جانا۔"

گاڑی چونکہ رفتار پکڑ چکی تھی اس لئے قمر ائرکنڈیشنڈ ڈبے میں ہی گھس گیا اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگا "صاحب جی، میرے پاس تو تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ اگر ٹکٹ چیکر آگیا تو وہ تو جی مجھ پر جرمانہ ٹھونک دے گا..... جرمانہ۔"

"بیٹا۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر تم جرمانے کی زد میں آگئے تو میں پے منٹ کردوں گا۔" پھر اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا۔ تم کہاں کام کرتے ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جی۔ میں پاکستان نیوی میں کام کرتا ہوں اور جہلم کا رہنے والا ہوں۔"

"خاص جہلم؟"

"نہیں جی، میں پنڈدادن خان کا رہنے والا ہوں۔"

"پنڈدادن خان کے کس قصبے میں رہتے ہو؟"

"جی۔ میرا آبائی شہر پنڈدادن خان ہی ہے۔"

"خیر سلا۔ تم تو میرے گرائیں نکلے۔ اچھا ابھی تو میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور جارہا ہوں۔ تم جب چھٹی پر آؤ تو مجھ سے ملنے ضرور آنا۔ یہ لو میرا کارڈ۔"

"جی۔ ضرور آؤں گا۔"

وزیٹنگ کارڈ پر روما شبانہ پڑھ کر خوشی کے مارے قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ تب تک اس پر منکشف ہو چکا تھا کہ روما شبانہ میں رات کے دوسرے پہر حسن کی دیویاں رقص کرتی ہیں۔ رقص کرتے کرتے غیر جامہ ہو کر درند بن جاتی ہیں اور پھر اپنے دل کش اعضائے جسمانی سے حاضرین کے دلوں میں سنسنی پھیلا کر ان کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتی ہیں۔

قمر بھی یہ ہوش ربا رقص دیکھ کر رقاصہ کے حسن کے نشتر سے اپنے دل کو چیرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ جھٹ پٹ تیار ہو کر بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد صدر جانے والی بس آگئی۔ وہ بس میں بیٹھ گیا۔ فریر روڈ پیٹرول پمپ کے پاس بس پہنچی تو وہ اتر کر ہاتھی کی مانند جھومتا روما شبانہ کی طرف چل دیا۔ روما شبانہ پہنچ کر اس نے استقبالیہ کاؤنٹر سے عمر خان صاحب کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ تو رات کے بارہ بجے آئیں گے۔

"افوہ.... اتنی دیر گئے تک میں کیسے انتظار کروں گا۔"

"صاحب جی۔ آپ رقص گاہ چلیں اور خوب صورت تتلیوں کے کرتب وغیرہ دیکھیں۔"

قمر نے زیرِ لب مسکراہٹ سے پوچھا "ٹکٹ کتنے کا ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، صاحب کے مہمان ہو کر ٹکٹ کا پوچھتے ہیں۔"

پھر قمر روشنیوں کے روشن ہال میں آگیا۔ جہاں دھیمی دھیمی سرخ روشنیوں کے جلوں میں ایک برہنہ رقاصہ اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی۔

قمر محوِ رقص ہو گیا۔ ڈانس دیکھتے دیکھتے وہ ایسا مدہوش ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اسے اس وقت خبر ہوئی جب ایک نیم برہنہ رقاصہ نے اسے کندھوں

سے زور زور سے ہلایا۔ وہ سحر طرازیوں کے جال سے باہر نکلتے ہوئے بولا "میڈم۔ کیا بات ہے؟"

"بات وات کچھ نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ کمرے میں.... یہ باس کا آرڈر ہے۔"

قمر خوشی خوشی اس کے ساتھ چل دیا اور اس کی سحر طرازیوں سے اپنے پیاسے دامن کو بھر لیا۔

بعد ازاں اس کی ملاقات عمر خان سے کرائی گئی تو وہ کچھ محجوب سا تھا۔

عمر اس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ارے قمر تم تو میرے گاؤں والے ہو۔ جب کبھی جی گھبرائے تو یہاں چلے آیا کرو اور جس تتلی سے چاہے انجوائے کرو۔"

عمر خان کی شیریں باتیں سن کر قمر کا دل کھل اٹھا۔ اس نے دیر گئے تک عمر خان سے باتیں کیں پھر عمر خان کا ڈرائیور اسے نیول بیس میں چھوڑ گیا۔

عمر خان کی دعوت پر وہ دوسرے ہفتے اس کے گھر گیا۔ اس کے گھر میں صرف اس کی بیوی رہتی تھی۔ وہ اس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی اور اس کے تین جوان بچے پنجاب میں رہتے تھے اور عمر کے کاروبار کو سنبھالے ہوئے تھے۔

عمر کی بیوی محل نما گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ جب جوانی کی آرزوئیں مچلتیں تو وہ کسی ہوٹل میں چلی جاتی اور اپنی منہ زور امنگوں کو لگام ڈال دیتی۔

قمر نے عمر کی جوان بیوی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ یہی حال عمر کی بیوی نائلہ کا بھی تھا۔ اسے اپنا شکار مل گیا تھا۔ وہ اسے پھانسنے کے لئے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی اور آنکھ جھپک کر اس کے دل میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتی۔

قصہ مختصر ان دونوں نے اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے کو دل دے دیا۔

پھر ایک فرحت آمیز رات نائلہ نے قمر کو جہاز پر فون کیا۔ "قمر۔ آج صاحب کاروبار کے سلسلے میں لاہور گئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آج کی رات تم میرے ساتھ بسر کرو۔ سن رہے ہو نا۔"

"جی سن رہا ہوں۔"

"تو پھر جلدی سے آجاؤ۔ میرا دل بری طرح مچل رہا ہے۔"

"او کے میڈم۔"

"میڈم نہیں، دل جاناں کہو۔"

"او کے دل جاناں۔"

پھر قمر پر لگا کر اپنی دل جاناں کے پاس پہنچ گیا اور رات بھر اس کے حسن کی کج ادائیوں سے فیض یاب ہوتا رہا۔ پھر وہ جب چاہتا اپنی شکار گاہ میں چلا جاتا اور اپنے دل ربا شکار کے سحر سے اپنے جوشیلے جذبات کو ٹھنڈا کرتا۔

○☆○

رات کے آٹھ بجے تھے۔ آسمان پر تیرتی ہوئی بدلیاں چاند سے آنکھ مچولی کر رہی تھیں۔ تیز و تند ہوا چل رہی تھی جس سے جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔

اس سے جہاز کے ساتھ ساتھ زمین کے چاند کا دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا من نائلہ کی سحر کاریوں و شوخیوں کے جال میں اسیر ہونے کے لئے بے تاب تھا لیکن وہ اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس دن اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔

لیکن جب اس کے من میں ملاپ کے شعلے بھڑکتے تو پھر وہ شعلوں کو سرد کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دوست سے گویا ہوا۔

"امجد۔ آج تمہاری بھابی کا خط آیا ہے۔ اس نے منی آرڈر بھیجنے کے لئے کہا ہے... اسے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی پوسٹ آفس صدر سے منی آرڈر بھیج دوں۔ لہٰذا میں تم سے امید کرتا ہوں کہ تم آج میری ڈیوٹی سرانجام دو گے.... پھر کسی دن میں تمہاری ڈیوٹی کر کے حساب بے باق کر دوں گا۔"

امجد ہنس کر بولا "ارے دوست۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، تم فکر نہ کرو۔ جا کر بھابی کو منی آرڈر کر آؤ۔"

قمر کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ وہ فوراً تیار ہوا اور اپنی منزل کی جانب چل دیا۔ پون گھنٹے کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر نوکر نے پٹ وا کیا۔ نوکر کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ ایک خوبرو اجنبی کے ہمراہ ہوٹل گئی ہیں تو اس کا دل بجھ گیا لیکن اس نے بیگم صاحبہ کے آنے کا انتظار کرنا مناسب گردانا۔ نوکر نے اسے چائے لا کر دی۔ وہ گرم گرم چائے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ وہ انجانے خیالات میں مبتلا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

قمر کی آنکھ کھلی، اس نے گھڑی دیکھی تو وہ ہڑبڑا اٹھا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا تھا کہ اس

نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو گھنٹوں میں واپس جہاز پر لوٹ آئے گا۔ لیکن تین گھنٹے تو گزر ہی چکے تھے۔ وہ پریشان خاطر ہو کر سیڑھیاں پھلانگتا بیگم صاحبہ کے کمرے میں گیا تاکہ جان سکے کہ وہ واپس آئی کہ نہیں۔

لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ وہ شرابور ہو کر کھڑکی کے پاس جا پہنچا اور تازہ ہوا کھانے لگا۔

ناگاہ اس کی نظر ایک ہیجان خیز نظارے پر پڑی تو اس کے دل میں ہوس کا جگنو جگمگا اٹھا۔ اس کے انگ انگ میں ہوس کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔

بھلا اس کا خون کیوں گردش نہ کرتا۔ اس نے پڑوس کے چھوٹے مکان کے تنگ صحن میں کھلے آسمان تلے ندیم کو اپنی بیوی زلیخا کی ساتھ حقِ زوجیت ادا کرتے دیکھ لیا تھا۔

چند لمحات گزرنے کے بعد ندیم چارپائی سے اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ڈانگری پہنے باہر نکلا اور دروازے کو بھیڑتے ہوئے بولا "زلیخا' دروازہ اندر سے بند کر لو۔" شاید ندیم نائٹ ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔

نصیبوں جلی زلیخا دروازہ بند کئے بغیر سو گئی۔ اس کے سونے کا انداز قہر کے لیے حشر سامانیاں پیدا کر رہا تھا۔ اندھا تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اب وہ صبر کے جامے میں نہ رہا۔

وہ فی الفور بیگم صاحبہ کے بنگلے سے باہر نکلا اور ندیم کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کو کنڈی لگا دی۔

پھر اس نے گھر کے اکلوتے کمرے کے اندر جھانکا تو اس نے دیکھا ایک ضعیف عورت چھوٹے سے بچے کو اپنے سینے سے لگائے سوئی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔

اچانک اس نے اپنے اوپر درندگی کا خول چڑھایا اور زلیخا کے ساتھ درندگی کرنے لگا۔ زلیخا کی غنودگی کافور ہو گئی۔ اسے سب کچھ لٹتا نظر آیا تو اس نے شور مچا دیا۔ قہر کا بھوت بھی اتر چکا تھا۔ وہ الٹے پاؤں بھاگ گیا۔

زلیخا کی ساس جو کمرے میں سوئی ہوئی تھی' وہ اس کی چیخ سن کر اٹھی اور باہر کی طرف

بڑھی۔ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ پھر وہ گھبرا کر اندر سے بولی "زلیخا۔ دروازہ کھولو..... کھولو۔"

لٹی ہوئی زلیخا نے دھوتی باندھی اور ڈگمگاتے قدموں اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ دروازے کو کھولا اور ساس کے ساتھ لپٹ کر زاروقطار رونے لگی۔

زلیخا کی ساس نے گھبرا کر پوچھا "اری بیٹی کیا ہوا..... مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"ماں۔ وہ لٹیرا جو بیگم عمر کے گھر اکثر آتا رہتا ہے' وہ میرا سب کچھ لوٹ کر لے گیا ہے۔"

"بیٹی تم نے شور کیوں مچایا۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔"

زلیخا ساس کی بات سن کر حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ متحیر و مغموم ہو کر کہنے لگی "میرا سب کچھ لٹ گیا اور میں شور بھی نہ کرتی۔"

"ارے بیٹی تم سماج کی کارستانیوں سے واقف نہیں ہو.... ابھی تو لٹیرے نے تمہیں لوٹا ہے۔ پھر تمہارا اپنا خاوند تمہیں ظلم کی چکی میں پیسے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ کوئی خاوند یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی غیر شخص اس کی بیوی کے ساتھ..."

اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے" اچانک زلیخا نے گڑگڑا کے فریاد کی "اے اللہ۔ کیا یہی تیرا انصاف ہے۔"

زلیخا کا پڑوسی جو اس کا شور سن کر وہاں پہنچ چکا تھا اور خوش دامن و بہو کی باتیں سن کر جان چکا تھا کہ اصل معاملہ کیا تھا' وہ زلیخا کو تشفی دیتے ہوئے بولا۔ "زلیخا' بیٹی صبر کرو۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

زلیخا پھٹ پڑی "خونخوار بھیڑئے نے میرا منہ کالا کر دیا ہے اور میں اپنی بربادی پر ماتم بھی نہ کروں۔ میں نے کون سا گناہ کیا ہے کہ میرے اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔ کیا اللہ بھی تماشا دیکھتا ہے.... تماشا۔"

گاما جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا' جان گیا کہ اب اس دلخراش حادثے پر مٹی ڈالنا مشکل تھا' بہت مشکل۔ زلیخا بدحواس ہو کر خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ رہی تھی۔ وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا "بیٹی۔ میں تھانے رپورٹ کرنے جا رہا ہوں تاکہ تجھے انصاف ملے اور قمر کیفرِ کردار کو پہنچے۔"

بعد ازاں گاما تھانے گیا۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود حوالدار کو کیس درج کرنے کو کہا۔ اس نے یہ سوچ کر رپورٹ چوری کی درج کرائی کہ ممکن تھا کہ زلیخا ہوش بحال ہونے پر اپنے ناکردہ گناہ کو چھپانا چاہے تو چھپا سکے۔

حوالدار نے ایف آئی آر کاٹی اور صبح ہونے پر زلیخا اور اس کے خاوند کو پولیس اسٹیشن رپورٹ کرنے کا آرڈر صادر کیا تاکہ کیس کو آگے بڑھایا جا سکے۔

۸ بجے اس کا خاوند ندیم بھی ڈیوٹی سے واپس گھر آگیا۔ اس کے عندالاستفسار پر ندیم کی ماں نے گامے کی ہدایت کے مطابق کہا "بیٹا رات کو چور گھر میں گھس آیا تھا...."

وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہ کرپائی تھی کہ زلیخا نے جھٹ کہا "چور نہیں لٹیرا... آپ کی بیوی کی عزت کا قاتل۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" ندیم نے غصے اور غم کے امتزاج سے کہا۔

"سائیں.....میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"تو پھر تمہارے ساتھ میرا رشتہ ختم۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ ایک مرد نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے... اب تم میرے قابل نہیں رہی ہو۔"

خاوند کی زہریلی بات سن کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولی "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کون سا پہاڑ توڑا ہے۔ خدارا مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیجئے۔ اپنی پیاری بیٹی کا خیال ہی کیجئے۔ اپنی بیٹی شمائلہ کے صدقے مجھے اپنے گھر کی زینت بنائے رکھئے۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔ آپ کی بیٹی بھی جیتے جی مرجائے گی۔"

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

ندیم نے پوچھا "کون؟"

باہر سے آواز آئی "میں پولیس مین ہوں....دروازہ کھولئے۔"

ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ پولیس مین نواز علیک سلیک کے بعد بولا۔ "کیا آپ کے گھر میں چوری ہوئی ہے۔"

"نہیں جی ہمارے گھر ڈاکہ پڑا ہے ڈاکہ..... اور ڈاکو میری بیوی کے زیورِ عصمت کو لوٹ گیا ہے۔"

"تو پھر آپ دونوں میاں بیوی تھانے چلیں.... آپ اس کا اتا پتا بتائیں ہم اسے پکڑ کر کڑی سزا دیں گے۔"

"میں کیوں جاؤں.... تم زلیخا کو لے جاؤ۔ زلیخا اس فلم کی ہیروئن اور ڈاکو ہیرو ہے۔"

یہ سنتے ہی ندیم کی ماں رحمتاں جوش میں آگئی۔ اس نے بیٹے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور کہا "بے غیرت.... یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو..... تم اپنی بیوی کو اکیلے تھانے بھیجنے پر تیار ہو.... تم جانتے نہیں ہو کہ تھانے میں بے کس اور مجبور عورتوں پر کس طرح کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔"

بیٹا بھی تاؤ میں آ کر بولا "زلیخا میری بیوی نہیں ہے۔ میں اسے تین طلاقیں دیتا ہوں.... طلاق.... طلاق.... طلاق۔"

بیٹے کی طلاق طلاق کی تلخ آواز سنتے ہی رحمتاں ڈولنے لگی۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسی اثنا میں ندیم نے کہا "نواز صاحب' تم کیا دیکھتے ہو.... آگے بڑھو اور اپنے مجرم کو پکڑ کر لے جاؤ۔"

"نہیں نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔" زلیخا اپنی معصوم بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے بولی۔

"آری حرام زادی.... تو کیسے نہیں جائے گی۔" سپاہی نواز نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی نواز نے زلیخا کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا تو زلیخا آہ و بکا کرنے لگی۔ ماں کی دلسوز چیخیں سن کر ننھی شمائلہ بھی رونے لگی۔ دونوں ماں بیٹی کی چیخوں سے دیواریں ارتعاش

میں آ گئیں اور فلک بھی رونے لگا۔

اس سے زلیخا نے روتے روتے فریاد کی "میرے مجازی خدا..... اگر مجھے زندہ درگور کرنا ہی چاہتے ہو.... اگر مجھے برباد کرنا ہی چاہتے ہو تو تمہاری مرضی لیکن کم از کم اپنی معصوم بچی کو تو سزا نہ دو۔ یہ لو اپنی بچی.... میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ لے لو اسے پلیز۔"

ندیم نے چنگھاڑتے ہوئے کہا "لے جاؤ اپنی بیٹی کو بھی ساتھ.... مجھے اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ بڑی ہو کر یہ بھی تمہاری طرح کنجری ہی بنے گی.... کنجری۔"

خاوند کے زہر آلود نشتر نے اس کے کلیجے کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اس نے روتے روتے کوٹھے کو سر پر اٹھا لیا۔

در آں اثنا نواز آگے بڑھا۔ اس نے زلیخا کو پکڑ لیا اور گھسیٹ کر ماں بیٹی دونوں کو وین میں ڈالا اور گاڑی کو بھگا کر لے گیا۔

جب زلیخا کو زبردستی وین میں بٹھایا جا رہا تھا تو رحمتاں چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھی۔ "خدا کے لئے میری بہو کو تھانے نہ لے جاؤ.... وہ بیچاری بے گناہ ہے۔ اسے ناکردہ گناہ کی سزا نہ دو۔"

پھر وہ آہ و بکا کرتے ہوئے وہاں کھڑے لوگوں سے بولی "تم لوگ تماشہ کس لئے دیکھ رہے ہو.... آگے بڑھو اور میری بہو کو ظالم پولیس مین کے چنگل سے چھڑاؤ۔"

جب کسی طرف سے بھی حرکت نہ ہوئی.... کوئی مائی کا لال بھی زلیخا کو چھڑانے کے لئے تیار نہ ہوا تو وہ پکار اٹھی "تم لوگ زلیخا پر ظلم ہوتا دیکھ رہے ہو.... اس لئے کہ وہ عورت ہے.... اس لئے کہ وہ کسی کی بیوی ہے..... کاش تم سمجھ سکتے کہ وہ کسی کی ماں ہے.... بہن ہے.... بیٹی ہے۔"

پھر وہ بھاگتی وین کی طرف دیکھ کر چلاّئی "میری معصوم بیٹی.... میری وفادار بیٹی...... میری بدنصیب بیٹی۔"

پھر رحمتاں کی نگاہ آسمان پر اٹھ گئی "خدایا.... کیا یہ تیری دنیا ہے.... کیا تو اسی طرح ظلم ٹوٹتے دیکھتا رہے گا..... کیا تو..... تو ہے بھی....."

پھر وہ دھڑام سے زمین پر گری اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

زلیخا نے چلتی وین سے ساس کو گرتے دیکھا تو اس کی چیخیں تیز ہو گئیں۔ "ماں .....ماں۔"

رحمتاں کے مردہ جسم میں اپنی معصوم بیٹی نے ایک دفعہ پھر جان ڈال دی لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ وہ اس ظلمی دنیا میں جینا نہ چاہتی تھی۔ وہ دنیا جس میں حوّا کی بیٹی کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی جاتی ہے۔

زلیخا تھانے پہنچ گئی۔ اس کے کیس کی تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ قمر اکثر بیگم عمر کے پاس آتا رہتا تھا اور زلیخا بھی کبھی کبھی ادھر چلی جاتی تھی اس لئے وہ قمر کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کس جہاز میں کام کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے تفتیشی افسر کو قمر کا اتا پتا بتا دیا۔

دوسرے روز پولیس مین جہاز پر گیا۔ اس نے جہاز کے کپتان کو اپنے آنے کا مقصد بتا دیا۔ کپتان نے قمر کو بلایا اور اس سے واردات کے متعلق پوچھا تو اس کے من میں بھونچال آ گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا لیکن اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"سر۔ اس رات تو میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں ڈیوٹی چھوڑ کر کیسے زلیخا کے گھر جا سکتا تھا۔"

پھر وہ اپنی بات کو لقمہ دیتے ہوئے بولا "ضرور زلیخا کو غلط فہمی ہوئی ہے.... رات کے اندھیرے میں وہ عصمت کے لٹیرے کو پہچاننے سے یقیناً قاصر رہی ہے... ورنہ وہ میرا نام ہرگز نہ لیتی۔"

پھر جہاز کے کپتان نے جہاز کے چیف انجینئر عاصم کو بلوایا۔ اس لئے کہ قمر انجینئرنگ برانچ سے تعلق رکھتا تھا اور وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔

عاصم نے پہنچتے ہی کپتان کو سیلوٹ کیا۔ اس نے وہاں سپاہی اور قمر کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ وہ جان گیا کہ ضرور قمر نے کوئی جرم کیا ہے لیکن وہ چپ رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے بلانے کا کیا مقصد تھا۔

تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد کپتان نے کہا "عاصم، یہ سپاہی تھانے سے آیا ہے۔ وہ قمر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ قمر پر الزام ہے کہ اس نے ایک عورت کی آبرو پر ہاتھ

ڈالا ہے۔ جب کہ قمر کا کہنا ہے کہ وہ وقوعہ والی رات ڈیوٹی پر تھا لہٰذا آپ ڈیوٹی روسٹر چیک کر کے بتائیں کہ کیا واقعی اس رات قمر ڈیوٹی پر تھا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" عاصم نے جواب دیا۔ پھر اس نے اسی لمحے جہاز کے انٹر کام کے ذریعے اپنے رائٹر کامران کو بلوا کر کہا۔

"کامران! ڈیوٹی روسٹر چیک کر کے بتاؤ کیا اس رات قمر ڈیوٹی پر تھا یا نہیں۔"

کامران نے آرڈر کی تکمیل کرتے ہوئے تیزی سے ڈیوٹی روسٹر کے اوراق پلٹنے شروع کر دیئے۔ چند ثانئے ہی گزرے ہوں گے کہ کامران نے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے کہا "سر! اس رات قمر ڈیوٹی پر تھا۔"

"کامران اب تم جاؤ اور میرے آفس میں میرا انتظار کرو۔" جہاز کے انجینئر عاصم نے کہا۔

اس کے بعد جہاز کے کپتان ہاشمی نے انجینئر عاصم سے کہا "آپ ایک لیٹر ایس ایچ او کے نام لکھیں اور اسے بتائیں کہ وقوعہ والی رات قمر ڈیوٹی پر تھا۔ لہٰذا نیوی قوائد کے مطابق قمر کو سول لا اتھارٹی کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔"

"اوکے سر۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور سیلوٹ کر کے اپنے آفس میں آگیا۔ اس نے اپنے رائٹر کامران سے لیٹر تیار کروایا۔ اس پر اپنے دستخط کئے اور کیپٹن ہاشمی کے کمرے میں داخل ہو کر کھڑے کھڑے کہا "سر یہ لیں لیٹر، تیار ہے۔"

"تھینک یو عاصم۔ تھینک یو۔"

کیپٹن ہاشم نے لیٹر پر اپنے دستخط کئے اور اسے تھانے کے سپاہی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ لیٹر ایس ایچ او صاحب کو دے دینا اور میری طرف سے زبانی کہہ دینا کہ قمر کا کیس ختم کر دیں.... اس دنیا میں زلیخا جیسی ہزاروں چڑیلیں ایسی ہیں جو شریف مردوں پر بہتان تراشی کر کے اپنا الّو سیدھا کرتی ہیں۔"

"بہت بہتر جناب۔" سپاہی نے لیٹر لیتے ہوئے کہا پھر سیلوٹ کیا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ جہاز کے عرشے پر تیز تیز ڈگ بھرتا جیٹی پر آیا اور اپنی بائیک پر بیٹھ کر پولیس اسٹیشن

واپس آگیا۔

اس کے بعد زلیخا کے ساتھ وہی وحشیانہ و مجرمانہ سلوک کیا گیا جیسا کہ تھانے میں غریب لیکن خوبصورت عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے.... تھانیدار تو درکنار سپاہی تک نے اسے اپنے دل کی زینت بنایا۔ غرضیکہ وہ ہفتہ عشرہ تک ارباب پولیس اسٹیشن کا کھلونا بنی رہی۔

پھر ایک دن اجڑی زلیخا کو اپنی بچی سمیت ایک رکشہ میں بٹھا دیا گیا اور رکشے والے کو آرڈر دیا گیا "اس خصمی و جہنمی عورت کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔"

"اوکے سر۔" رکشے والے نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

رکشے والے نے حیران و پریشان عورت سے پوچھا "محترمہ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

زلیخا کچھ دیر چپ رہی پھر چند ثانئے کے توقف کے بعد اس نے جواب دیا "میں کیماڑی میں رہتی ہوں۔ رکشہ کیماڑی لے چلو۔"

جونہی رکشہ کیماڑی پل پر پہنچا تو زلیخا نے کہا "اے...ذرا رکشہ روکو۔ مجھے قے آرہی ہے۔" رکشہ ڈرائیور نے اس خوف سے کہ کہیں عورت رکشے میں ہی الٹی کر کے سیٹ کو خراب نہ کر دے، یکایک بریک لگایا اور رکشے کو روک کر بولا " رکشے سے اترو اور قے کر لو۔"

پھر زلیخا رکشے سے اتری اور آناً فاناً سمندر میں کود گئی۔

رکشہ ڈرائیور تیرنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک اجنبی عورت کو بچانے کے لئے پانی میں کود گیا۔ اس نے ڈبکیاں کھاتی عورت کو پکڑ لیا اور بڑی مشکل سے کھینچ کر رکشے کے پاس لے آیا۔ رکشہ کے پاس کافی لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ ایک آدمی نے اس کی روتی ہوئی بچی کو اٹھا رکھا تھا۔ زلیخا نے جھپٹ کر اس آدمی سے اپنی بچی کو لے لیا اور اسے سینے سے بھینچ کر آہ و فغاں کرنے لگی۔

در آں اثنا اس کے کانوں میں بھنک پڑی۔ "اس عورت نے خودکشی کی ہے۔ اس کو تھانے لے چلیں۔"

زلیخا چیخ کر بولی "میں تھانے نہیں جاؤں گی... پولیس والے عصمت کے لٹیرے ہیں....

خدارا مجھے ان لٹیروں کے مت حوالے کیجئے...... مت....."

پھر رکشہ والا اس کی مدد کو پہنچا۔ اس نے فہم و ادراک سے کام لیتے ہوئے کہا "اے لوگو ...... تم کیا جانو اس مظلوم عورت پر کیا کیا ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ یہ ضرور مظلوم و مسکین ہے۔ ہمیں اس کا ہمدرد و غمگسار بن کر اس کے گہرے زخموں کی مرہم پٹی کرنی چاہئے۔"

رکشے والے کی مختصر مگر پر اثر تقریر نے اپنا اثر دکھایا اور مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔

پھر رکشے والا آگے بڑھا اور ملائمت سے بولا "محترمہ رکشہ میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

زلیخا کے لئے رکشہ ڈرائیور کی آواز نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ وہ پولیس اسٹیشن جانے سے بچ گئی تھی۔ وہ فی الفور رکشے میں بیٹھ گئی اور آناً فاناً رکشہ بندر روڈ پر دوڑنے لگا۔

تھوڑی دور جا کر رکشہ ڈرائیور نے رکشہ سڑک کے کنارے روک کر پوچھا۔ "میڈم میرا نام مظفر ہے...... تمہیں گھر پہنچانے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے خودکشی کیوں کی ہے.... میں چاہتا ہوں کہ تمہاری مدد کروں بشرطیکہ یہ میرے دائرہ اختیار میں ہو۔"

زلیخا نے روتے روتے الف سے لے کری تک اپنی دلخراش داستان سنا دی۔

زلیخا کی دکھوں بھری کہانی سننے کے بعد مظفر دل گیر ہو کر بولا "زلیخا میں بھی اکیلا ہوں۔ نصرت بھٹو کالونی میں ایک کٹیا نما مکان میں رہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میری بیوی بن کر میرے گھر میں خوشیوں کا دیا روشن کر سکتی ہو۔"

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد زلیخا نے نرم آواز میں کہا "خاوند.... یہ بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے.... اگر یہ رشتہ ہوتا تو ندیم مجھے ناکردہ گناہ کی سزا نہ دیتا.... میں نے تو اس دنیا میں جینے کا انداز بھی نہ سیکھا تھا کہ مجھے مکروہ و گھناؤنے جال میں جکڑ دیا گیا۔ پھر منافقین جال میں جکڑی عورت پر اپنی ہوس کے تیر برسانے لگے۔ یقین کرو مظفر، مجھے کسی سے شکایت نہیں.... کسی سے بھی نہیں... ندیم سے بھی نہیں.... اگر شکایت ہے تو اپنے خدا سے کہ جس نے ایک غریب و بے کس عورت کی عزت و آبرو کی حفاظت نہیں کی۔" پھر زلیخا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مظفر نے اسے تشفی دیتے ہوئے کہا "عورت کو سائبان کی از حد ضرورت ہوتی ہے۔ تنی ہوئی سائبان کی۔ چھپّر کے بغیر تم ظلمی دنیا کی تمازت سے نہ بچ سکو گی، لوگ چیل کی طرح تمہارا گوشت تک نوچ لیں گے اور تم تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گی۔"

"لیکن مظفر....."

"ہاں..... بولو پلیز..... کچھ تو بولو"

"میں تو دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورت ہوں.... ایک ناکردہ گھناؤنے گناہ نے میری زندگی کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے۔ اور تم...."

"ہاں ہاں بولو۔"

"اور تم اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو.... آخر کیوں.... میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ کبھی نہ کبھی تم ضرور مجھے اپنی طنز و تشنیع کا نشانہ بناؤ گے۔ تم مجھے اس نہ کئے ہوئے مذموم فعل کی ضرور سزا دو گے۔ تم بھی مرد ہی ہو نا..... جب تمہارا ضمیر جاگے گا.... جب تمہیں کوئی اچھی عورت مل جائے گی تو پھر اس سے شادی رچا لینے کے لئے ایک یہی معمولی بہانہ کافی ہو گا۔ یہ منحوس عورت ہے ...بدکردار ہے.... بیچ ہے.... کنجری ہے.... میں اسے طلاق دیتا ہوں۔"

"جانِ من، زلیخا......... ایسا مت کہو...... میں کبھی بھی کسی عورت سے شادی نہیں کروں گا..... اور نہ ہی کوئی اللہ کا بندہ مجھے اپنا داماد بنائے گا.... اس لئے کہ....."

"ارے مظفر۔ چپ کیوں ہو گئے ہو۔"

"اس لئے کہ کوئی بھی شخص مجھے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

زلیخا نے حیران ہو کر کہا "مظفر تم خوبصورت ہو، جوان ہو اور پھر کماؤ بھی ہو۔ پھر کیوں تمہیں کوئی بھی شخص اپنی دامادی میں لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

مظفر نے دل گرفتہ ہو کر جواب دیا "میں نے ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس کا نام مسرت تھا۔ اللہ نے مجھے پیاری سی بیٹی بھی دی تھی۔ وہ چاند سے بھی خوبصورت تھی۔ میری بیٹی تین ماہ کی ہوئی تو ایک روز مسرت نے مجھ سے کہا "منی کے ابا،

ہماری منی کتنی خوبصورت بچی ہے۔ یہ جُگ جُگ جئے۔ لیکن ایک بات میں سمجھ نہیں پائی ہوں۔ منی ہنستی و مسکراتی ہے لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قطعی نہیں دیکھتی..... خدا جانے کیا بات ہے۔"

میں نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے جواب دیا "اری بیگو۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ وہم ہے.... تھوڑا اسے اور بڑا ہونے دو پھر دیکھنا' یہ تیرا خوب نکو بنائیگی.... تیری چوٹی پکڑ کر ایسے کھینچے گی کہ تجھے دادی مرحومہ یاد آجائیں گی۔"

"لیکن ڈاکٹر کو دکھانے میں کیا حرج ہے۔" مسرت نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

پھر ہم نے ایک معروف ماہرِ چشم کو دکھایا تو یہ جان کر ہم پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ ہماری منی پیدائشی اندھی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی کے دلوں پر چھریاں چل گئیں۔ میں بڑی مشکل سے رکشہ ڈرائیو کر کے گھر پہنچا اور آتے ہی مسہری پر گر پڑا اور آٹھ آٹھ آنسو بہانے لگا۔ مسرت بھی زارو قطار رو رہی تھی۔ منی نے بھی خوب ہم دونوں کا ساتھ دیا۔ رات روتے روتے گزر گئی۔ پھر ہمیں اپنے سینوں پر صبر کی سل رکھنی پڑی اور لیل و نہار اپنی رفتار سے گزرنے لگے۔

منی کی پیدائش کے دس ماہ بعد ہماری خوشیوں کا نیا سورج طلوع ہوا۔ اللہ نے ہمیں پیارا سا بیٹا دیا۔ قمر سا۔ ہم نے اس کا نام قمروش رکھا۔

ماہ بھر ہی گزر پایا ہوگا کہ ہم دونوں میاں بیوی نے محسوس کیا کہ قمروش کی عادات بھی ہو بہو اپنی بہن پر گئی تھیں۔ وہ بھی بہن کی طرح ہی دیکھتا تھا۔ ہمارے دل خوف و تاسف سے مرجھا گئے۔ ہم میں ہمت نہ پڑتی کہ ہم قمروش کا معائنہ کراتے۔ آخر دلوں کو تھام کر ہم نے قمروش کا چیک اپ کرایا۔ لیکن میں ڈاکٹر کے پاس نہ گیا بلکہ ڈاکٹر کے کمرے کے باہر انتظار کرتا رہا۔ مجھ پر انجانا سا خوف سوار تھا۔

مسرت اکیلی ڈاکٹر کے کمرے میں گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مسرت ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا۔ مجھے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ قمروش بھی اندھا تھا.... میرا دل پارا پارا

ہو گیا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ انتظار گاہ میں بیٹھے لوگوں نے مجھے سہارا و حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر بھی کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے بھی مجھے تسلی و تشفی دیتے ہوئے صبر کرنے کی تلقین کی۔

لیکن کسی کی پند و نصیحت میرے غموں کا مداوا نہ بن سکی۔ میں جھومتے و لرزتے اپنی شکستہ دل بیوی کے ہمراہ باہر آیا اور ٹیکسی ہائر کی۔ کیونکہ رکشہ چلانے کی مجھ میں ہمت و طاقت نہیں تھی۔ ویسے اگر میں رکشہ خود چلاتا تو بہت اچھا ہوتا..... میرا کسی کار وغیرہ سے ضرور ایکسیڈنٹ ہوتا اور ہم مرجاتے.... پھر کوئی مجھے ملامتوں کا تختۂ مشق نہ بناتا اور میں بھی اپنے آپ کو مسرت کا مجرم نہ گردانتا۔

قصہ مختصر مسرت اور میں بوجھل دلوں کے ساتھ گھر پہنچے۔ ہم نے غم کے مارے کھانا تک نہ کھایا۔ مسرت کا بھی برا حال تھا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ وہ بیچاری ایک ہی رات میں رو رو کر آدھی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں سوج کر بند ہونے کو تھیں۔

پھر میں نے.... میں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کے سینے کی جھونپڑی کو یہ کہہ کر آگ لگادی "مسرت تمہاری گود کبھی تندرست بچے کو نہیں کھلائے گی۔ میں نے غوروخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں طلاق دے کر کم از کم اپنی زندگی کو تابندہ بنالوں۔"

مسرت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ وہ طلاق کا نام سن کر دست بستہ بولی "سرتاج۔ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ مجھے در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچالو۔ تم دوسری شادی کرلو' مجھے نوکرانی بنا کر رکھ لو لیکن مجھے طلاق نہ دو.... میں اندھے بچوں کی کیسے پرورش کروں گی... مجھے اپنے سائبان تلے رہنے دو تاکہ میں انہیں پال پوس سکوں۔"

میں گرج کر بولا "تمہارے بچے بھاڑ میں جائیں۔ میں تمہارے بچوں کی خاطر اپنی زندگی کو برباد نہیں کر سکتا.... میں آج شام ڈھلے تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

تب وہ دل تھام کر بیٹھ گئی اور میں باہر نکل آیا اور رکشہ ہائر کر کے ڈاکٹر کے چیمبر کے پاس پہنچا۔ وہاں اپنے کھڑے رکشے کو چلا کر اپنے دھندے میں جت گیا۔

شام کو جب میں گھر واپس لوٹا تو اپنی بیوی کو بمعہ دونوں بچوں کے غائب پایا۔ دیر گئے

تک سوچتا رہا۔ ''مسرت کہاں جاسکتی ہے۔ اس کا کراچی میں تو کیا' دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے.... اس لئے میں نے اس سے شادی ایدھی گھر سے کی تھی....'' پھر میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

صبح میں اٹھا اور ناشتہ بنانے میں مصروف ہوگیا۔ توے پر ڈبل روٹی گرم کی۔ آملیٹ بنایا۔ چائے تیار کی اور ناشتہ کرنے کے لئے میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے لقمہ اٹھایا لیکن وہ حلق میں نہیں جارہا تھا۔ میں بیوی اور بچوں کے لئے پریشان تھا۔ مسرت ضرور ایدھی گھر گئی ہوگی... میں نے سوچا۔ پھر بغیر ناشتہ کیے ایدھی گھر کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگا کہ اسے منا لاؤں۔

معًا دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کنڈی کھولی تو دیکھا کہ میرا پڑوسی اقبال کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اخبار تھا۔ وہ اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔

''مظفر بہت برا ہوا.... بھابی نے بچوں سمیت کیماڑی پل سے کود کر خودکشی کرلی ہے.... وہ اور دونوں بچے مرگئے ہیں۔''

میرا ضمیر جاگ پڑا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا... میں سینہ کوبی کرکے روتا رہا۔ مجھے میرے ضمیر نے ملامت کی۔ ''تو نے اپنی معصوم بیوی پر ظلم توڑا ہے۔ اس کا کیا قصور تھا کہ اس کی کوکھ سے اندھے بچوں نے جنم لیا۔ قصور تو تمہارا ہے کہ جس نے اسے مرجانے پر مجبور کیا۔ تم پاپی ہو.... تم مسرت اور بچوں کے قاتل ہو... خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

پھر میرے گھناؤنے پاپ پر میرے پڑوسی مجھ سے نفرت کرنے لگے.... پھر وقت گزرنے کے ساتھ میں نے پڑوسیوں کو یہ کہتے بھی سنا ''مظفر کا خون ہی ایسا ہے.... جس سے اندھے بچے پیدا ہوتے ہیں۔''

وہ بازگشت میرے لئے سمِ قاتل تھی۔ کیونکہ کوئی شخص بھی مجھے اپنا جگر کا ٹکڑا دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میرے خون کی بدولت ان کی بیٹی سے بھی اندھے بچے ہی جنم لیں گے۔''

تھوڑی دیر کے لئے مظفر چپ رہا۔ پھر روہانسا ہو کر بولا ''زلیخا یہ وہی پل ہے جہاں مسرت نے خودکشی کی تھی اور جہاں تھوڑی دیر ہی پہلے تم نے بھی خودکشی کی ناکام کوشش کی ہے.... اب اس پل پر ہی تمہیں نئی زندگی دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرکے مسرت کی روح کو تسکین اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری بچی کا باپ بننا چاہتا ہوں.... میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے بھی ابو کہہ کر بلائے۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔ ''میں تم سے شادی کرنے کے بعد بھی کسی بچے کا باپ نہیں بن سکتا.... باپ نہیں بن سکتا.... اس لئے کہ میں نے اپنا آپریشن کرادیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں سچ مچ میرا خون خراب نہ ہو اور کسی دوسری مسرت کو میرے کئے کی سزا بھگتنی نہ پڑے۔ اب میں حقِ زوجیت تو ادا کرسکتا ہوں لیکن کسی بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔ اگر تم آپریشن کی یقین دہانی چاہتی ہو تو پھر ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں اور اس سے تم کنفرم کرلینا یا میری پیٹھ کے آپریشن کے ٹانکے دیکھ لو۔''

مظفر نے جھٹ پیٹھ سے قمیض اوپر اٹھادی اور زلیخا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ مظفر کے سینے کے زیروبم سے زلیخا کو ایسے محسوس ہوا جیسے صدیوں کے بعد اس کے من کا پھول کھلا ہو۔

مظفر زلیخا کو لے کر اپنے گھر آگیا۔ عدت گزرنے کے بعد وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

پھر وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ زلیخا کے کٹیا میں آجانے سے اس کے وارے نیارے ہوگئے۔ اسے سواریاں زیادہ ملنے لگیں اور روز افزوں اس کی دولت بڑھتی گئی۔ اس نے اپنی حلال کی کمائی سے دوسرا' پھر تیسرا رکشہ خریدا۔ پھر ویگن اور بس.... ایک بس سے اس کی پانچ بسیں ہوگئیں۔ وہ کراچی کا سیٹھ بن گیا۔ مظفر' سیٹھ مظفر....

○☆○

قمر کی پیٹی آفیسر کے عہدے پر پروموشن ہوگئی اور اسے نیوی کا کوارٹر بھی مل گیا۔ اس نے اپنی بیوی اور اپنے بیٹے ہاشم کو کراچی بلوالیا۔ اس نے اپنے دوستوں کی دیکھا دیکھی ہاشم کو مانٹیسوری میں داخل کرادیا۔

ایک دن ہاشم معصومانہ انداز میں بولا "بابا جانی، تمام بچے تفریح کے وقت دہی بڑے کھاتے اور کولڈ ڈرنک پیتے ہیں جب کہ میں ان کا منہ دیکھتا رہتا ہوں اور وہ مجھے چڑا چڑا کر کھاتے ہیں۔"

ابھی وہ اپنا جملہ مکمل بھی نہ کرپایا تھا کہ بابا نے اس کے رخسار پر تڑاخ سے طمانچہ جڑ دیا اور گرج کر بولا "بے غیرت کہیں کا۔ دوسرے بچوں کی نقل کرتا ہے۔ کل وہ کنوئیں میں چھلانگ ماریں گے تو کیا تُو بھی کنوئیں میں کود جائے گا.... خبردار جو آئندہ پیسے ویسے مانگے۔"

معصوم بچے کا رخسار گلاب کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس نے سہم کر چیخنا شروع کردیا۔

حسینہ نے سہمے سہمے ہاشم کو اٹھالیا اور اسے والہانہ انداز سے چومنے لگی۔ پھر بے خیالی میں اس کے منہ سے گھٹی سی آواز نکل گئی۔ "ظالم، ننھے سے لوتھڑے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے تمہارے ہاتھ نہیں کانپتے۔" معاً قمر نے حسینہ کو بالوں سے پکڑ کر زور زور سے کھینچا اور دو چار تھپڑ اسے بھی رسید کردیئے۔

ایک روز ہاشم مانٹیسوری سے واپس آیا تو اس کا بابا سویا ہوا تھا۔ وہ توتلی زبان میں بولا۔ "اماں مجھے ہر روز میڈم مارتی ہے کہ میں ہوم ورک کرکے نہیں لاتا.... اماں میں ہوم ورک کیسے کروں جب کہ میرے پاس نوٹ بکیں نہیں ہیں۔ اماں بابا جانی کو کہیں نا کہ مجھے کاپیاں لے کردیں۔"

بیٹے کا معصومانہ التماس سنتے ہی حسینہ نے اسے گلے لگالیا۔ اس کی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ اس نے روہانسی ہو کر کہا۔ "اچھے بیٹے ضد نہیں کرتے۔ جب کبھی

تمہارے تایا ابا ملنے کے لئے آئیں گے تو انہیں کہوں گی کہ وہ تمہارے لئے ڈھیروں کاپیاں لے آئیں۔"

"امی تایا جان تو ٹرانسفر ہو کر عرصہ دراز سے کراچی آئے ہوئے ہیں لیکن وہ صرف ایک دفعہ پچھلی عید پر ہمیں ملنے کے لئے آئے تھے۔ کیا اس بار بھی وہ عید پر ہی آئیں گے۔ اماں وہ اب کیوں نہیں آتے؟"

ماں بیٹے کی کھسر پھسر قمر نے سنی تو وہ پہلو بدلتے ہوئے زور سے چلّایا "تم دونوں مجھے سونے دو گے کہ نہیں۔" اس کے ساتھ ہی دونوں ماں بیٹے کو سانپ سونگھ گیا۔ حسینہ چپکے سے بیٹے کو لے کر کچن میں آگئی اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے لگی۔

ایک دن موسم نہایت سہانا تھا۔ رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ قمر صاحب لحاف اوڑھے ریڈیو پر فلمی گیت سن رہے تھے۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مرغی فلیٹ کی سیڑھیوں کے نیچے دبکی بیٹھی تھی۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ اس نے بڑے چاہت بھرے لہجے میں ہاشم کو بلایا "بیٹا جانی ادھر آؤ۔"

"جی بابا۔"

"بیٹا دیکھو وہ سیڑھی کے نیچے مرغی بیٹھی ہے۔ ہولے ہولے وہاں جاؤ اور مرغی کو پکڑ کر اندر لے آؤ۔"

"لیکن بابا جانی وہ مرغی تو پپّو لوگوں کی ہے۔"

"بیٹا چھوڑو پپّو شپو کو۔ جاؤ جلدی سے مرغی پکڑ لاؤ۔ لیکن خیال رکھنا مرغی کی آواز نہ نکلے۔"

ہاشم نے اپنے باپ کے حکم کی تکمیل کی اور مرغی پکڑ لایا۔ قمر نے فوراً مرغی پر چھری پھیری اور صاف کرنے کے بعد ہاشم کی اماں کو بھوننے کے لئے کہا۔

حسینہ نے بھی بغیر کسی چوں چرا کے مرغی کے گوشت کو بھون ڈالا۔ طشت میں سجایا اور مرغی کی لذیذ ڈش قمر کے آگے رکھ دی۔ قمر چٹخارے لے لے کر بھنی مرغی کو کھا گیا لیکن اس نے حسینہ تو کجا ننھے چور کو بھی کھانے کی دعوت نہ دی۔ وہ بیچارہ پاس کھڑا باپ کو کھاتے دیکھتا

رہا۔

قمر کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ وہ خود خوب خورونوش کرتا تھا لیکن اس کی بیوی اور بچہ عام کھانے کے لئے بھی ترستے تھے۔ وہ انواع و اقسام کے مشروب پینے کا بھی رسیا تھا لیکن وہ ان کو بند الماری میں رکھتا تھا۔ اس کی چابی وہ اپنے پاس رکھتا۔

حسینہ اور اس کے بیٹے کو ہمت تک نہ ہوتی کہ وہ الماری کھول کر اس میں سے کوئی چیز لیتے۔ اگر خدانخواستہ کبھی کسی سے غلطی ہو جاتی تو پھر اسے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ ڈنڈے اور جوتے سے چور کی پٹائی ہوتی۔

باپ نے ہاشم سے مرغی پکڑوا کر اسے چوری کی عادت ڈال دی تھی۔ وہ اکثر اس سے چھوٹی موٹی چوریاں کرواتا رہتا۔

اس کے کلاس فیلوز قسم قسم کی چیزیں کھاتے تو اس کا دل للچاتا..... پھر اس نے اپنی بھوک کا حل نکال لیا۔ وہ موقعہ بہ موقعہ کسی دوست کی جیب صاف کر لیتا اور پھر مزے لے لے کر کھاتا.... اب دوستوں کی جیبیں صاف کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا... وہ آتے جاتے کسی ریڑھی والے کے فروٹ پر بھی ہاتھ صاف کر لیتا اور اپنا پیٹ بھر لیتا.... لیکن وہ کبھی چوری کا فروٹ گھر نہیں لایا۔ اسے اتنی عقل ضرور تھی کہ اگر اس کی ماں کو خبر ہو گئی تو وہ اس کی خوب پٹائی کرے گی مزید برآں وہ اس کی مذموم حرکت پر روئے گی بھی اور خوب روئے گی.... وہ ننھا اپنے ماں کے دکھی آنگن میں غموں کا اندھیرا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حسینہ کے کراچی آنے کے دو ماہ بعد قمر عالم کی چیف پیٹی آفیسر کے عہدے پر ترقی ہو گئی اور اس کا تبادلہ ایک بہت بڑے تباہ کن جہاز میں کر دیا گیا۔ اس جہاز میں ٹرانسفر ہونے کے بعد اس نے بہت سے ممالک کے خیرسگالی دورے کئے جن میں نمایاں نام مصر، جبرالٹر، مالٹا، پرتگال، فرانس، برطانیہ، اور امریکہ وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر ملک کے سمندر کے کناروں، تفریحی مقامات اور تھیٹرز وغیرہ میں وہ گیا اور ان کی سحر طرازیوں و جلوہ سامانیوں سے دل کھول کر اپنے ذہن و قلب کو سیراب کیا۔ اُسے اس عنصر کی قطعی فکر لاحق نہ تھی کہ اس کی بیوی اور بچے نے اپنی آنکھیں اور دل اس کے لئے فرشِ راہ کر رکھے ہیں۔ اس کی غیر

موجودگی میں اگر یہی کرتوت اس کی بیوی بھی کرنے لگ جائے تو پھر اس کے دل پر کیا گزرے گی اور کیا وہ اپنی بیوی کو معاف کر پائے گا۔ ہرگز نہیں۔ تو پھر قمر نے اس صراطِ مذموم کا انتخاب کیوں کیا جس پر اگر بھولے سے اس کی بیوی قدم رکھ دے تو وہ اسے بھون کر رکھ دے۔

حیف صد حیف، راہ سے بھٹکا ہوا کوئی مرد بھی اس امر پر غور نہیں کرتا اور وہ بڑی تمکنت و حشمت کے ساتھ اس گناہوں کی جل تھل میں دھنستا ہی جاتا ہے۔

یہی حال قمر کا تھا.... پھر اسے ایک زرنگار موقعہ مل گیا۔ پاکستانیوں کو ایک جدید فریگیٹ کی ضرورت تھی جس کی ایک سال کی ٹریننگ کے لئے لگ بھگ ایک سو سیلرز اور آفیسرز کا تبادلہ لیورپول (برطانیہ) کر دیا گیا۔ اس لسٹ میں قمر کا نام بھی شامل تھا۔ یہ فرحت آمیز خبر سن کر خوشی کے سمندر میں اس کا رواں رواں غریق ہو گیا۔ پھر ماہ بھر کے اندر وہ لیورپول پہنچ گیا۔ اپنے فرسٹ ویک اینڈ پر قمر نے ٹیکسی ہائر کی اور ۲۱۰ میل کا فاصلہ طے کر کے لندن کی ہائیڈ پارک میں پہنچ گیا۔ قبل ازاں اس نے لندن کے تفریحی مقامات مثلاً ٹاور آف لندن، بکنگھم پیلس جو ۱۸۳۷ء سے بادشاہوں کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور ریجنٹ پارک جس میں جھیل، پھولوں کا باغ، اوپن ائر تھیٹر اور لندن کا قدیم چڑیا گھر وغیرہ ہیں، دیکھے ہوئے تھے لیکن اس نے ہائیڈ پارک نہیں دیکھا تھا۔

ہائیڈ پارک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ وہاں بغیر کسی خوف و خطر کے برے سے برا کام کر سکتے ہیں۔ تقریر کریں، حاکمِ وقت کو گالیاں دیں، عیش و عشرت کریں یا سیر و سیاحت کریں، القصہ جو جی میں آئے کریں۔

اس روز موسم نہایت سہانا تھا۔ آسمان پر بادل کی ٹکڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ گلے مل رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی گرج کے ساتھ ہلکی سی پھوار بھی پڑ جاتی۔ اس خفیف سی پھوار نے گلوں کو موتیوں کے ہار پہنا رکھے تھے۔ ہوا کے شریر جھونکے غنچوں کی خوشبو چرا کر فضا کو مہکا رہے تھے۔

ایسے سہانے سے ہائیڈ پارک کے ہر سو دیوانوں اور الھڑ جوانیوں کا میلہ لگا تھا۔ کوئی تقریر

کر رہا تھا اور کوئی تقریر سن رہا تھا۔ کوئی گانا گا رہا تھا اور کوئی اچھل رہا تھا۔

کوئی من چلا کسی من دیوانی کے ساتھ جھاڑی کی اوٹ میں عیش کے چھرے اڑا رہا تھا۔

قصہ مختصر پارک کے ہر کونے میں خوشیاں ہی خوشیاں ہی بکھری پڑی تھیں۔

اس کھلتے دمکتے موسم میں قمر سحر طرازیوں و رنگینیوں سے مسحور و مخمور ہو کر آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے ایک خوبصورت دوشیزہ نظر آئی جو پہلو کے بل لیٹے کوئی انگریزی کا ناول پڑھ رہی تھی۔ قمر یک دم رک گیا۔ وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ سرو قد... گوری رنگت... صراحی دار گردن.... ستواں ناک...... جھیل نما سیاہ آنکھیں.... گھونگریالے بال اور سڈول جسم۔

دم تیغ دوشیزہ نے قمر کے دل کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ دم بخود کھڑا اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ اس گوری لڑکی کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک ایشیائی لڑکا اسے گھائل کر جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے تو وہ فوراً اٹھی اور اس کے قریب آ کر فرنگی زبان میں بولی۔ "اے.... مجھے کیوں گھور گھور کر دیکھے جا رہے ہو؟"

فرنگی حسینہ کے میٹھے بول نے قمر کے کانوں میں انگبین کا رس گھول دیا اس میں دم آ گیا۔

وہ محظوظ ہو کر بولا "آج میں مالٹا پہنچ گیا ہوں۔ جمہوریہ مالٹا جو کئی جزیروں پر مشتمل ہے۔ جس کا رقبہ صرف ۱۲۲ مربع میل ہے۔ جو سسلی سے ۶۰ میل جنوب کی طرف اور افریقی ساحل سے ۱۸۰ میل شمال میں واقع ہے۔"

"آپ مالٹا کیوں پہنچ گئے؟"

"تمہیں جو دیکھا ہے۔"

"مجھ میں ایسی کون سی ادا دیکھی ہے کہ تم مالٹا پہنچ گئے ہو؟"

"گوری رنگت' سیاہ بال' سیاہ آنکھیں' مالٹا کی نازنینوں کا طرۂ امتیاز ہے۔"

"لیکن میں مالٹا کی رہنے والی نہیں ہوں۔ میں تو برمنگھم کی ہوں اور آج سیر کے لئے ۱۱۷ میل کی لمبی ڈرائیو کر کے ادھر آ نکلی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں۔"

"چلو اچھا ہوا۔"

"پر کیوں؟"

"یہ میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں' ذرا بیٹھو تو سہی۔" قمر نے اس کے نازک ہاتھ کو اپنے کھردرے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

وہ دوشیزہ قمر کے کہنے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

قمر اپنی خمار زدہ آنکھیں اس کی ترستی آنکھوں میں ڈال کر بولا "تمہارا نام؟"

"میرا نام الزبتھ ہے۔"

"الزبتھ۔ میرا جہاز خیر سگالی کے دورے پر مالٹا گیا تھا۔ وہاں میں رقص گاہ میں گیا۔ وو جنگلی مادہ و نرل کر عریاں رقص کر رہے تھے۔ پھر رقص کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے دنیاوی رنگینیوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ لوگ ڈوب کر عالمِ رنگ و نور سے فیض یاب ہونے لگے۔ مجھ پر بھی جنس کا ملمع چڑھ گیا۔ میں بے خود ہو کر اسٹیج کے قریب گیا تو مہوش رقاصہ نے آگے بڑھ کر مجھے چوم لیا اور میری ٹوپی اتار لی پھر وہ اسے سر پر پہن کر اپنے ساتھی جوان کے ساتھ فعلِ ہوش ربا میں جت گئی۔ ان دونوں کا ننگ دھڑنگ اور جل ترنگ رقص ختم ہوا تو تماش بین اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔"

چند ثانئے کی خاموشی کے بعد قمر نے الزبتھ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے دباتے ہوئے گویا ہوا "میں نیوی یونیفارم پہنے ہوئے تھا اور میری ٹوپی خوبرو رقاصہ لے کر چلی گئی تھی۔ اس خوبرو رقاصہ کا ڈیل ڈول' چہرہ' رنگت' بال' آنکھیں' ہو بہو تمہارے جیسی تھیں۔ میں اس کا درشن کرنے اور ٹوپی لینے کے لئے فرسٹ فلور پر واقع اس کے کمرے میں چلا گیا۔ جونہی میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ ایک مرد اور ایک عورت کا روحانی ملاپ.....

"میں دروازے کو بند کر کے الٹے پاؤں بھاگا..... اور ڈانسر سے اپنی ٹوپی لئے بغیر جہاز میں پہنچ گیا۔ جو کہ ایک جرم تھا۔ اس جرم کی سزا مجھے نہایت سخت ملی۔ میرا باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا اور پھر میں اس بجلی گراتی رقاصہ سے دوبارہ نہ مل سکا۔ جس کا صدمہ مجھے ہمیشہ جلاتا و ستاتا رہا...... تھوڑی دیر پہلے تک۔"

"او ہو... تمہاری رام کہانی تو بہت دلچسپ ہے۔ لیکن ایک بات کی گرہ تو کھول دو.... وہ

یہ کہ تھوڑی دیر پہلے تمہارا اس سے نہ ملنے کا غم کیسے ختم ہو گیا۔"

"جانِ جاناں.... میری داستان ہی دلچسپ نہیں بلکہ میں خود بھی دلچسپ ہوں۔ رہا سوال یہ کہ میں اپنے غم کو کیسے بھول گیا تو وہ اس لئے کہ مجھے تم مل گئی ہو۔" قمر نے اس کے رخسار پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

الزبتھ لبوں پر دل چیرنے والی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے گویا ہوئی۔ "قمر تم واقعی دلچسپ آدمی ہو۔ دیکھو نا' پل بھر کی ملاقات میں تم میرے ذہن سے اتر کر میرے دل میں بس چکے ہو۔"

"سچ!" قمر نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔" الزبتھ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر.... پھر.... قمر نے بڑھ کر الزبتھ کو سینے سے بھینچ لیا۔

الزبتھ کے والدین دو سال قبل کار ایکسیڈنٹ میں وفات پا چکے تھے۔ وہ برمنگھم میں بیوٹی پارلر چلا کر گزر اوقات کر رہی تھی۔ اس کی صرف ایک بہن تھی جس کا نام مارگریٹ تھا اور وہ ایک معروف کالج میں تعلیمی مراحل بحسن وخوبی طے کر رہی تھی۔ دونوں بہنوں میں پیار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ دونوں بہنیں ڈبل بیڈ پر اکٹھی سوتیں اور اکٹھی سیر وغیرہ کو نکلتیں۔

لیکن جس حسین دن الزبتھ و قمر کے درمیان حسین ملاقات ہوئی تھی اس دن مارگریٹ کے سالانہ امتحان کا انگلش پیپر تھا۔ اس روز الزبتھ کا دل گھبرایا تو وہ اکیلی سیر کو نکل پڑی۔ اس نے ایک لمبی ڈرائیو کی اور ہائیڈ پارک پہنچ گئی جہاں اسے خوابوں کا شہزادہ مل گیا اور وہ شہزادے کو دل دے بیٹھی۔

ان دونوں کے سماج' معاشرے' رہن سہن اور مذہب میں زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔ لیکن مشہور مقولے کے مصداق کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے' وہ ان دوریوں اور فاصلوں سے مبرّا ہو کر صراطِ چاہت پر چل کر یک جان و دو قالب بن چکے تھے۔ ان دونوں کی محبتوں کے شب و روز ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ ان دونوں نے لیل و نہار کی حسن آرائیوں

سے خوب انجوائے کیا۔ امتحان کے بعد مارگریٹ بھی فارغ ہو گئی تھی۔ وہ بھی سیر و سیاحت میں ان کی شریکِ سفر بن گئی۔ پھر ان تینوں نے مل کر برمنگھم' لیورپول' لندن' مانچسٹر اور دیگر مشہور شہروں کی جی بھر کر سیر کی۔

ان دونوں کے پیار و محبت کے دن رات ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں ڈھل گئے۔ پیار کرتے کرتے نو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ ایک دن وہ دونوں لیورپول کے ساحلِ سمندر پر گئے۔ دونوں سمندر میں جی بھر کر نہائے اور لہروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی لہریں بنتے رہے۔ پھر وہ ریت پر لیٹ گئے اور دھوپ کھانے لگے۔

چند لمحات کے بعد الزبتھ نے اپنا سر قمر کی چھاتی پر رکھا اور مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دونوں شادی کے مضبوط بندھن میں بندھ جائیں۔"

"لیکن الزبتھ تم عیسائی ہو اور میں مسلمان ہوں۔" قمر نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"تو کیا ہوا... ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔" الزبتھ نے مچل کر کہا۔

"لیکن میں تو فقط تین ماہ بعد پاکستان چلا جاؤں گا۔ پھر تم یہاں اور میں وہاں.... اس شادی کا کیا فائدہ جب پتی اور پتنی اکٹھے نہ رہ سکیں۔" قمر نے متحیر ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں گی۔ تمہارے ساتھ پاکستان میں وائف بن کر رہوں گی۔ اور تمہارے پپا' مما' برادر اور سسٹر وغیرہ سے ملاقات بھی کر لوں گی۔"

"الزبتھ تم جوش میں.... محبت کے جوش میں سب کچھ کہے تو جا رہی ہو لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ بیٹھی ہو۔" قمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے اس دنیا میں کون سا کام مشکل ہے۔ پاکستان جانے میں کون سی دیوار حائل ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی۔" الزبتھ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اری پاگل... پہلی بات تو ہمارے ذریعۂ سفر پر آ کے رکتی ہے۔ میں تو اپنے بحری جہاز سے پاکستان جاؤں گا۔ جب کہ تم میرے ساتھ نیول جہاز میں سفر نہیں کر سکتیں' نیول کوڈ کی رُو سے صرف کیپٹن کی بیگم اپنے شوہر کے ساتھ جہاز میں سفر کر سکتی ہے اور میں تو صرف

...صرف چیف پیٹی آفیسر ہوں۔"

"ارے قمر... میں ہوائی جہاز سے پاکستان آجاؤں گی۔" الزبتھ نے بے ساختہ کہا۔

"لیکن پاکستان آنے کے لئے تمہیں ویزے کی ضرورت پڑے گی۔" قمر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"پیارے قمر، میں تو تمہاری وائف ہوں.... ویسے بھی پاکستان کے لئے ویزا لینا بچوں کا کھیل ہے۔" الزبتھ نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

"لیکن تمہاری بہن مارگریٹ کا کیا بنے گا؟" قمر نے ہنس کر اس کے دل پر چوٹ لگائی۔

"ہاں۔ یہ بات تو سوچنے والی ہے۔" الزبتھ سنجیدہ ہو کر بولی۔ الزبتھ سوچوں کے سمندر میں غرق ہو گئی۔ تھوڑے توقف کے بعد الزبتھ مسرور ہو کر گویا ہوئی "مارگریٹ کی تعلیم مکمل ہونے تک میں برمنگھم میں ہی رہوں گی۔ اس کے بعد میں پر لگا کر پاکستان آجاؤں گی۔" پھر الزبتھ نے مچلتے ہوئے کروٹ بدلی اور قمر کے ساتھ سینہ لگا کر لیٹ گئی۔ اس نے قمر کو اپنے ساتھ بھینچ کر پوچھا۔ "پھر ہمیں کب میرج کرنی چاہئے...اب تو بتاؤ جانی۔"

اس سے قبل کہ قمر جواب دیتا، الزبتھ نے اپنے گلابی ہونٹ اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔

قمر اس کے سرخ ہونٹوں اور سینے کے زیرو بم کی گرمائش سے پگھل کر بولا "ہم کل ...کل ہی کورٹ جائیں گے اور میرج کرلیں گے۔"

پھر دوسرے دن الزبتھ اور قمر نے کورٹ جاکر شادی رچالی۔ قمر نے کسی نہ کسی طرح انجینئر افسر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لی اور جادو نگری کے مختلف سحر انگیز شہروں میں ہنی مون کی خوشیوں سے لطف اٹھایا۔

○☆○

ایک شام آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف تیرہ اندھیرا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ قمر حسبِ معمول ویک اینڈ پر اپنی بیوی کے گھر برمنگھم گیا۔ اطلاعی گھنٹی کے بجنے پر اس کی اکلوتی سالی مارگریٹ نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے نوشا بھائی کا استقبال کیا۔ وہ اس وقت بنیان اور نیکر میں ملبوس تھی۔

قمر نے اس کی خوبصورت ٹانگوں اور دلکش ابھاروں کو دیکھا تو اس کے اندر سویا ہوا شیطان جاگ پڑا۔ اس کے انگ انگ میں خمار کی لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں میں مستی کی چمک آگئی۔ فکر و سوچ پر اندھے پن کی چادر بچھ گئی۔ وہ کیف و خمار میں چُور ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

چند لمحات کے بعد چاہت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ "الزبتھ کہاں ہے؟"

"پیارے بھیا... الزبتھ شاپنگ سینٹر گئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شادی ہوئے دو ماہ بیت چکے ہیں لیکن اس نے آپ کو کوئی شادی کا گفٹ نہیں دیا.... وہ آپ کے لئے انمول سوغات لینے گئی ہے۔"

"وہ کب آئے گی؟" قمر نے خمار آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً دو گھنٹے کے بعد۔" مارگریٹ نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ پھر وہ یہ کہہ کر کچن کی طرف دوڑ گئی "میں اپنے پیارے بھیا کے لئے گرم گرم چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

مارگریٹ چائے کی پیالی تھامے پھولوں کی طرح مسکراتے ہوئے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے جونہی چائے تپائی پر رکھی۔ ابر زور سے گرجا اور برسنے لگا۔ ساتھ ہی بجلی گرجی.... بجلی کی مہیب کڑک سے مارگریٹ اچھلی اور بستر پر گر پڑی۔

قمر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بے غیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھ کر مارگریٹ کو اپنی مضبوط بانہوں میں دبوچ لیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ مارگریٹ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ بہن

بھائی کے واسطے دیئے لیکن بے سود..... وہ ناموس کی بازی ہار گئی۔

بے حمیت قمر نے جب مارگریٹ کی دنیا لوٹ لی تو اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی۔ وہ بے سدھ مارگریٹ سے روہانسا ہو کر بولا "مارگریٹ خدارا' مجھے معاف کردو۔"

مارگریٹ نے بہروپئے کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں۔ قمر پر نظر پڑی تو آنکھیں جھکا لیں اور زور سے آہ وبکا کرنے لگی۔

قمر اسے تشفی دیتے ہوئے بولا "مارگریٹ چپ ہوجاؤ..... اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

جب قمر نے دیکھا کہ اس کی مکّارانہ باتوں کا مارگریٹ پر رتّی بھر اثر نہیں ہوا تو وہ جھوٹ موٹ کے اشک اپنی بے غیرت آنکھوں میں سجائے بولا "مارگریٹ' میں نے نیچ کام کیا ہے..... نیچ لیکن اس نیش زنی کی اگر بھنک بھی الزبتھ کے کانوں میں پڑ گئی تو پھر الزبتھ اور میری زندگی میں بھونچال آجائے گا۔ ہماری زندگی شکست وریخت سے دوچار ہوجائے گی۔ شائد تمہاری بہن اور میری راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائیں۔"

پھر قمر نے ہاتھ جوڑ کر مارگریٹ پر اپنے فریب کا جال پھینکا۔ "مارگریٹ' اب الزبتھ اور میری تابندہ زندگی کی چابی تمہارے ہاتھوں میں ہے..... تم..... صرف تم ہمارے خوابوں کے ذی شان قصر کو مسمار ہونے سے بچا سکتی ہو۔"

آخر قمر نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مارگریٹ کو رام کر ہی لیا۔ آہ' وہ بیچاری بھی عورت ہی تھی نا..... دوسری عورتوں کی طرح عورت..... عورت جو مرد کے مکروفریب کے جال میں پھنس کر اس کے مظالم اور زیادتیوں کو فراموش کرکے پھر اس کی محبت کے راگ الاپنے لگتی ہے..... اور وہ بھنورا اس کا رس چوس چوس کر اس کو کملا دیتا ہے اور پھر اڑ کر کسی دوسرے خوبصورت پھول پر بیٹھ جاتا ہے۔

پھر قمر' الزبتھ اور مارگریٹ کی گاڑی پہلی طرز پر چلنے لگی۔ اگر کبھی قمر کا تنہائی میں مارگریٹ سے سامنا ہوجاتا تو وہ جادو بھری نظروں سے اسے دیکھتا اور وہ لجا کر آنکھیں نیچے کر لیتی۔ لیکن قمر کی سعیِ مذموم ہوتی کہ وہ مارگریٹ کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لے۔

لہٰذا وہ وقت کی راگنی الاپ کر اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتا رہتا۔ بہنوئی ہونے کے ناتے اسے خلوت کے اَن گنت مواقع ملتے رہے اور وہ اس پر اپنی محبت کا تیر چلاتا رہا۔ آخر وہ اس کے تیر کی زد میں آگئی اور وہ درخت کے پھل کی طرح اس کی گود میں گر پڑی۔ اب وہ دونوں الزبتھ کی غیر موجودگی میں خوب رنگ رلیاں منانے لگے۔

قمر نے الزبتھ سے شادی تو رچالی تھی لیکن اسے جب گھر کا خیال آتا تو وہ اداسیوں کے طوفان میں گھر جاتا۔ اسے حسینہ اور اپنے بیٹے ہاشم کی یاد ستانے لگتی۔ لیکن جب اسے الزبتھ اور مارگریٹ دونوں بہنوں سے معاشقے کا خیال آتا تو اس کی یاد پر دھند چھا جاتی۔ وہ حسینہ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگتا۔

وہ لندن میں عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بیوی اور سالی دونوں اس کی منظورِ نظر بن چکی تھیں۔ اب اس کی نظریں کسی اور کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اب وہ تعاقب مارگریٹ کے حصول کا تھا۔ مارگریٹ کو اپنانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیونکہ کسی بھی مذہب کے کلچر و معاشرے میں سالی سے عشق کے پیچ لڑانا گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ مارگریٹ کی محبت کی زلفوں کے سائے تلے دم بھر کے لئے ستا سکتا تھا۔ جس کے لئے ضروری تھا کہ الزبتھ اور اس کا میاں بیوی کا رشتہ قائم رہے۔

لیکن اس نے اپنے گھناؤنے خواب کو تعبیر کا لبادہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنی چاند جیسی بیوی حسینہ کو بذریعہ رجسٹری طلاق بھیج دی۔

پوسٹ مین نے حسینہ کے گھر کی کال بیل پر جونہی انگلی رکھی' حسینہ دوڑتی' ہانپتی' باہر آگئی کیونکہ وہ وقت ڈاکئے کے آنے کا تھا اور اس وقت اسے اپنے محبوب کے خط کے آنے کا انتظار رہتا تھا..... اس نے عین توقع کے مطابق ڈاکئے کو گھر کے سامنے کھڑا دیکھا تو وہ تیزی سے اندر گئی اور حسبِ معمول پرس سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر لے آئی۔ اس نے خوشی خوشی پانچ روپے کا نوٹ پوسٹ مین کے ہاتھوں میں تھمایا اور مسکراتے چہرے کے ساتھ رجسٹرڈ خط وصول کیا پھر گنگناتے ہوئے خط کھولا۔

جونہی طلاق کے لفظ پر حسینہ کی نظر پڑی تو اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ اس کا سر چکرایا'

وہ ڈولنے لگی اور دروازے کے پاس ہی فرش پر دھڑام سے گر پڑی۔

حسینہ کا بیٹا ہاشم اس دن بخار میں مبتلا ہونے کی بنا پر اسکول نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے گرنے کی آواز سنی تو وہ بھاگتے ہوئے ماں کے پاس پہنچ گیا اور ماں ماں پکارنے لگا۔ بچے کی دل گیر آواز سن کر حسینہ کی پڑوسن شبنم وہاں پہنچ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے حسینہ کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور فی الفور آفتاب کو بذریعہ فون بدنصیب حسینہ کی بے ہوشی کی اطلاع دی۔

آفتاب فوراً پہنچ گیا۔ اس دوران حسینہ بھی ہوش میں آچکی تھی لیکن غم کے مارے وہ نیم مردہ دکھائی دیتی تھی۔ آفتاب اس کی حالت دیکھ نہ سکا۔ وہ دل کو مسوس کر گویا ہوا۔ ”بھابی! کیا دلخراش حادثہ پیش آگیا ہے کہ تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔“

”آفتاب۔“

”ہاں بھابی۔“

”آفتاب، میں کرموں جلی لٹ گئی ہوں۔ لٹ گئی ہوں۔“ حسینہ اتنا کہہ کر بلک بلک رونے لگی۔

”بھابی خدا کے لئے بتاؤ معاملہ کیا ہے۔“ آفتاب نے دل گرفتہ ہو کر پوچھا۔

”قمر نے مجھے طلاق بھیج کر میرے دل کو کرچی کرچی کر دیا ہے۔ اب مجھ میں جینے کی ہمت نہیں رہی۔“ یہ کہہ کر حسینہ سسکیاں بھرنے لگی۔

یہ زہر آگیں خبر سنتے ہی آفتاب کا دل بجھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھلا اور یوں لب کشائی کی۔ ”حسینہ بھابی، مجھے اس عنصر کا شدت سے احساس ہے کہ تمہارے خوابوں کا تاج محل منہدم ہو چکا ہے۔ تمہارا دل ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ لیکن تمہیں کرچیوں کو سمیٹ کر اپنے بیٹے ہاشم کے لئے جینا ہو گا۔ نہیں تو وہ بگڑے سماج کی ہوا کے تیز جھونکے سے پتے کی مانند ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور در در کی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔“

”نہیں، میں اس ظلمی دنیا میں جینا نہیں چاہتی۔“

”تو پھر اپنے ہاتھوں سے ہاشم کا گلا گھونٹ دو۔“

”نہیں۔ میں اپنے معصوم بیٹے کو قتل نہیں کروں گی۔“

”تو پھر اسے جینے کا حق دے دو۔ جینے کا حق۔“

”حق دے دوں۔ حق.... حق۔“ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آفتاب اکثر بھابی کے پاس آتا رہتا اور اسے تشفی و حوصلہ وغیرہ دیتا رہتا۔ ایک روز حسینہ روہانسی ہو کر بولی ”آفتاب، مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ چکا ہے۔ باوجود اس کے کہ میں ہاشم کے لئے جینا چاہتی ہوں لیکن میں پنجاب ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں ٹائپنگ جانتی ہوں۔ میں کسی ٹائپنگ سینٹر میں استانی لگ کر اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال لوں گی۔“

”لیکن اس کے لئے ہمیں اپنے والدین کو مطلع تو کرنا پڑے گا کہ قمر نے کیا گل کھلائے ہیں اور تمہاری زندگی کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“ آفتاب نے حسینہ کو مشورہ دیا۔

”تو پھر بذریعہ فون انہیں حقیقت سے آگاہ کر دو۔“ حسینہ نے برجستہ کہا۔

”نہیں حسینہ نہیں، میں انہیں کراچی کسی بہانے بلواؤں گا: اور پھر صبر و حوصلے کی چھتری تلے بٹھا کر انہیں یہ دلسوز آپ بیتی سنائیں گے اور انہیں رنجور اور افسردہ ہونے سے بچائیں گے۔“ آفتاب نے اپنا مدبرانہ فیصلہ سنایا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ حسینہ نے غموں کی چادر کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

آفتاب کے دور اندیشانہ منصوبے کے مطابق دونوں کے والدین کراچی پہنچ گئے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آفتاب یوں گویا ہوا۔

”میرے بزرگو.... حیف صد حیف کہ میں اب ایک ایسی بات کہنے والا ہوں جس کو سننے کے لئے آپ سب کو اپنے جگر کو بڑا کرنا ہو گا۔“

آفتاب کے دلسوز جملے کو سن کر ہی ان پر غموں کی چادر بچھ گئی۔ وہ ہکا بکا ہو کر آفتاب کا منہ دیکھنے لگے اور اس کی زہر آگیں بات سننے کے لئے محوِ انتظار ہو گئے۔

آفتاب نے ان کو زیادہ انتظار کرنے کی زحمت نہ دی اور ٹھہر ٹھہر کے متکلم ہوا۔ ”قمر نے.... حسینہ.... کو طلاق دے دی ہے۔“

یہ سن کر ان پر بجلی گر پڑی ان کے کھلتے قلوب مرجھا گئے۔ کچھ دیر کے لئے گھر میں سناٹا چھا گیا۔

کچھ دیر کے بعد آفتاب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اب حسینہ چاہتی ہے کہ کسی ٹائپنگ سینٹر کو جوائن کرکے گزر اوقات کرلے لیکن میرے خیال میں اس کے لئے یہ کام بہت مشکل ہے۔ بھلا ایک عورت ذات ناخدا کے بغیر فرسودہ رسموں کی جھیل کو کیسے پار کرسکے گی..... اس کے لئے ضروری ہے کہ حسینہ دوسری شادی کرلے۔"

آفتاب کی سنکھیا آمیز بات کو سنتے ہی حسینہ آگ بگولہ ہو کر بولی "نہیں.... نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا... میں کسی حال میں بھی عقدِ ثانی نہیں کروں گی... مجھے مردذات سے نفرت ہوگئی ہے.... نفرت... نفرت..... جو بغیر کسی گناہ کے عورت کی زندگی کی کشتی کو بیچ منجدھار میں ڈبو دیتا ہے۔"

"لیکن طلاق یافتہ عورت اور وہ بھی ایک بچے کی ماں سے کون شادی کرے گا؟" حسینہ کی ماں نے افسردگی کی چادر اوڑھ کر کہا۔

آفتاب تھوڑی دیر کے لئے بت بنا سوچتا رہا۔ آخر حوصلہ کرکے بولا "آنٹی... میں.... میں نے آج تک شادی نہیں کی.... اس لئے کہ میں نے جب پہلی دفعہ حسینہ کو دیکھا تو وہ میرے دل میں بس گئی تھی۔ پھر میں نے اسے اپنی زوجہ بنانا چاہا..... لیکن میرے بھائی قمر نے میرے سنہرے سپنوں کے آگے اپنی آرزو کا بند باندھ دیا۔ اس کی آرزو تھی.....وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کی محبوبہ حسینہ تھی۔ حسینہ بھی اس کی حسین آرزو کی شریکِ سفر تھی۔ مجبوراً مجھے اپنی خواہش کو اپنے سینے میں دفن کرنا پڑا۔

"اب جبکہ قمر نے حسینہ کو طلاق دے دی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ حسینہ کو اپنے دل کے آنگن میں آباد کرلوں اور اپنے معصوم بھتیجے کو باپ کے پیار سے نواز کر اسے یتیم ہونے سے بچالوں۔"

"میں نے کہہ دیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی.... آپ لوگ کان کھول کر سن لیں.... آئندہ گھر کے کسی فرد نے میری شادی کا نام لیا تو اپنے بیٹے کو اپنی کمر کے ساتھ کس کر سمندر

میں کود جاؤں گی۔" آفتاب کی تلخ بات سنتے ہی حسینہ آگ بگولا ہو کر بولی۔

آفتاب سمیت گھر کے سب افراد حسینہ کا آخری فیصلہ سن کر "صم بکم" ہوگئے۔ تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد آفتاب نے دھیمی آواز میں کہا "حسینہ...اب تمہارا قمر کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے.... لہٰذا نیول ریگولیشن کے مطابق اب تم موجودہ مکان میں رہائش نہیں رکھ سکتی ہو۔ تمہیں یہ مکان چھوڑنا ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے والدین.....یا میرے والدین کے ساتھ پنجاب چلی جاؤ۔ اور آرام و سکون سے اپنی بقیہ زندگی بسر کرو۔"

"میں پنجاب قطعی نہیں جاؤں گی.... میں یہاں کراچی میں ہی رہوں گی.... اور اپنے یتیم بیٹے کی پرورش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گی۔ اسے مانٹیسوری میں ہی تعلیم دلواؤں گی۔" حسینہ نے ذرا ملائمت سے جواب دیا۔

"رہو گی کہاں؟"

"کرائے پر مکان لے لوں گی۔"

"ارے پگلی' میرا گلشنِ اقبال والا مکان بن کر تیار پڑا ہے۔ میں ابھی تک وہاں شفٹ نہیں ہوا ہوں... اگر تم چاہو تو وہاں رہائش اختیار کرسکتی ہو۔ وہاں تمہیں دوہری سہولت بھی مل جائے گی۔ ایک تو پپو کی مانٹیسوری بھی نزدیک ہے دوسرے ایک معروف ٹائپنگ سینٹر بھی چند قدموں کے فاصلے پر ہے جہاں تم ملازمت بھی اختیار کرسکو گی۔ تمہیں اور پپو دونوں کو بس وغیرہ میں سفر کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی..... اور وقت کی بچت الگ ہوگی۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں مکان کا کرایہ ضرور دوں گی۔" حسینہ نے آفتاب کی بات کو معقول سمجھ کر ہمت سے کہا۔

"منظور ہے... لیکن جب کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے.... چاہے ضرورت کی نوعیت کوئی بھی ہو مثلاً وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں اپنا موجودہ فیصلہ اچھا نہ لگے تو مجھے ضرور یاد کرلینا۔" آفتاب نے دلربا ہنسی سے کہا۔

"میں بڑی ہمت والی عورت ہوں۔ مجھے کبھی بھی اپنے دانشمندانہ فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا۔" حسینہ نے پُرعزم ہو کر کہا۔

بعد ازاں دونوں کے والدین پنجاب چلے گئے اور حسینہ اپنے غمگسار و ہمدرد آفتاب کے بنگلے میں شفٹ ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد، حسینہ ماجد ٹائپنگ سینٹر گئی۔ دروازے کو ناک کر کے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور سامنے بیٹھے پکی عمر کے آدمی سے مخاطب ہوئی "سر، کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

سینٹر کا مالک ماجد عینک کو ذرا اوپر کر کے بولا "یس۔" پھر اس نے اشارے سے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے حسینہ سے پوچھا "یس محترمہ، کیا بات ہے؟"

"سر میں بطور ٹیوٹر آپ کا سینٹر جوائن کرنے کی آرزومند ہوں۔" حسینہ نے شیریں زبان میں جواب دیا۔

"جاؤ لڑکی... اپنا راستہ لو..... ہمیں کسی استاد کی ضرورت نہیں ..... میں تو سمجھا تھا کہ کوئی اسٹوڈنٹ وارد ہوئی ہے، کچھ آمدنی میں اضافہ ہو گا... لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ رہے ہیں... جاؤ بی بی جاؤ۔" ماجد نے طنز آمیز لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

حسینہ نے فٹ کرسی چھوڑ دی اور رنجیدہ دل کے ساتھ دروازے کی طرف چل دی لیکن بے خیالی میں اس کے منہ سے نکل گیا "میں نصیبوں جلی طلاق یافتہ، چاہتی ہوں کہ اپنے زور بازو سے روزی کما کر اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالوں...... لیکن اس نگری کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ کسی کو کسی سے ہمدردی نہیں۔"

طلاق یافتہ اور مجبور لڑکی کے آخری جملے کو سن کر ماجد کی مایوس آنکھوں میں امید کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے خوش ہو کر آواز دی۔ "میڈم!"

"جی سر۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو کر جا رہی ہیں۔"

"جی تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے کہا تھا کہ میں اپنا راستہ لوں۔"

"اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ ضرورت مند عورت ہیں، بے کس و بے یار و مددگار عورتوں کی مدد کرنا تو میں نے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ بلکہ میرا سینٹر

کھولنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں نادار عورتوں کی مدد کر سکوں.... آج سے تمہاری نوکری پکی۔"

"تھینک یو سر.... سر تنخواہ کتنی دیں گے؟"

"جتنی آپ کے گزارے کے لئے کافی ہو گی۔"

"سر ایک ہزار روپیہ کافی ہو گا۔"

"میں تمہیں دو ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ دوں گا.... اس کے علاوہ اوور ٹائم بھی۔"

"سر.... آپ مذاق تو نہیں کر رہے!"

"نہیں میڈم۔" ماجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

ملازمت مل جانے پر حسینہ نہال ہو گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر واپس آئی۔ اس نے بسرعت پپو کے لئے مزیدار کھانا پکایا اور اسکول سے اس کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

پپو کے آنے کا وقت قریب پہنچا تو وہ دروازہ کھول کر باہر کھڑی ہو گئی۔ معاً اسے پپو آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر وہ مچل گئی۔ اس کا رُواں رُواں لہرانے لگا۔ جونہی پپو قریب پہنچا اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اسے چومنا چاٹنا شروع کر دیا۔

پپو حیران ہو کر بولا "ماں، آج اتنی فرحاں و مہربان کیوں ہو؟"

"بیٹے آج مجھے ملازمت مل گئی۔ اب میں بیٹے کو اچھے اچھے مرغوب کھانے پکا کر کھلاؤں گی۔"

"پھر تو ماں..... میرے وارے نیارے ہو گئے..... آپ خوش ہوتی ہیں تو پھر آپ مجھے پیار بھی کرتی ہیں، نہیں تو خواہ مخواہ ڈانٹتی رہتی ہیں۔"

"شریر کہیں کے۔" حسینہ نے شادمانی سے پپو کے گلابی رخسار کو چومتے ہوئے کہا۔

نوکری کرتے حسینہ کو ہفتہ ہی گزر پایا تھا کہ دوسرے ہفتے کے پہلے روز ماجد حسینہ سے یوں مخاطب ہوا "آج ایک کانفیڈینشل لیٹر ٹائپ کرنا ہے.... اسے اوور ٹائم میں ٹائپ کر دینا۔"

"اچھا باس۔" حسینہ نے کچھ بے دلی سے کہا کیونکہ اس روز اُس نے پپو کو سیر کرانے کا

وعدہ کیا تھا۔

ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا تو حسینہ نے باس سے پوچھا "سر کون سا لیٹر ٹائپ کرنا ہے۔"

ماجد نے اپنی عینک کو اتار کر میز پر رکھا اور خمار آلود آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ حسینہ لجا سی گئی پھر وہ کرسی سے اٹھا اور فی الفور دروازے کو کنڈی لگا دی۔

حسینہ سہم گئی۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ وہ چوکنا ہو گئی۔

خبیث باس نے اپنا دایاں ہاتھ حسینہ کے شانے پر رکھا اور ہنسیاں بکھیرتا گویا ہوا "لیٹر وغیرہ تو کوئی ٹائپ نہیں کرانا... بس تمہیں اپنے دل کی رام کہانی سنانی ہے اور پیاس بجھانی ہے۔"

پھر وہ اسے اپنی کمزور بانہوں میں لے کر بولا "میں تم سے محبت کرتا ہوں..... میں نے آج تک شادی نہیں کی کیونکہ کوئی لڑکی میرے دل میں نہ سما سکی... اب میری زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک خوبصورت سی گڑیا نے میرے دل کو چیر کر رکھ دیا ہے... میں تم سے شادی کر کے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا چاہتا ہوں۔"

معاً حسینہ نے اس کے کمزور بازوؤں کے حصار کو توڑ کر اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا اور کنڈی کھول کر باہر آ گئی پھر تیز تیز قدم اٹھاتے گھر پہنچ گئی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پپو ماں کی حالت غیر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے رک رک کر پوچھا "ماں.... ماں کیا بات ہے؟ آج..... آپ پھر غصے سے کپا بنی ہوئی ہیں۔"

حسینہ نے پپو کی بلائیں لیتے ہوئے کہا "پپو بیٹے... آج سے میں نوکری نہیں کروں گی۔"

پپو اچھل کر بولا "بہت خوب..... ہاں بہت خوب..... اب تو میں چھٹی کے دن ماں سے خوب باتیں کروں گا اور کلفٹن کی سیر کروں گا... اب تو ماں تھکاوٹ وغیرہ کا بہانہ نہیں بنائے گی۔ کیوں ماں ٹھیک ہے ناں؟"

"ٹھیک تو ہے لیکن پیسہ کہاں سے آئے گا۔"

"ابو ڈرافٹ بھیجیں گے۔"

"بھاڑ میں گئے تیرے ابو..... ہمارے لئے وہ مر چکا ہے۔" حسینہ نے لال سرخ ہو کر کہا۔

"ماں ایسا نہ کہو کہ ابو مر گئے ہیں۔" پپو نے توتلی زبان میں کہا۔

"پپو تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ وہ مر چکے ہیں۔ اگر وہ مر نہ گئے ہوتے تو ہم مکان خالی کیوں کرتے۔" حسینہ نے روتے ہوئے بیٹے کو سمجھایا۔

"ایسی بات ہے تو ہم تایا ابو سے کہیں گے کہ وہ ہمیں پیسے وغیرہ دیں اور ہمارے پاس ہی رہیں۔" پپو نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش ایسا......" حسینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور ننھا پپو حیران و پریشان ہو کر ماں کی ٹھنڈی گود میں بیٹھ گیا۔

ماں کے آنسو لڑھک لڑھک کر پپو کے سر پر ٹپ ٹپ کرنے لگے اور وہ فرحت پا کر فٹ ماں کی گود میں سو گیا۔ حسینہ نے اٹھ کر پپو کو پلنگ پر لٹایا اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گئی۔ اس کے دل میں پپو کی بصیرت آمیز بات کھلبلی مچانے لگی۔

"ہم تایا ابو کو کہیں گے کہ وہ ہمارے پاس رہیں۔"

سوچتے سوچتے نیند اس سے کوسوں دور بھاگ گئی۔ اس کے ذہن میں انجانے خیالوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ اپنے پرتو سے مخاطب ہوئی۔

"حسینہ 'یہ دنیا بڑی ظالم ہے..... یہ دنیا بے کس عورت کے لئے جنگل ہے.... جنگل جہاں شیر و بھیڑیئے اس کو چبانے کے لئے گھات لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ پھر موقعہ ملتے ہی وہ اسے دبوچ کر اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اگر عورت کو اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی ہے تو پھر اسے باڈی گارڈ کی شدید ضرورت ہے۔ عورت کا باڈی گارڈ اس کا شوہر ہوتا ہے۔ شوہر عورت کے لئے ایک سایہ دار شجر ہوتا ہے۔ جس کی چھاؤں تلے بیٹھ کر وہ دنیا کی ہر تمازت سے بچی رہتی ہے۔"

پھر اس کے پرتو نے اسے مشورہ دیا "آفتاب آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ وہ تجھے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ اس نے تو تیرے لئے ایثار کا فقید المثال مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے تیری خوشنودی کی خاطر تجھے قمر کے پلے باندھ دیا تھا اور خود زندگی بھر شادی نہ کرنے کی سوگند کھائی تھی۔ کیا اب

بھی تُو اسے پیار کے جواب میں پیار نہیں دے سکتی.... کیا تو اس کے تیرہ و تار آنگن میں خوشیوں کا اجالا نہیں بکھیر سکتی۔ تجھے اس کا خیال نہیں تو اپنا اور اپنے منے کا خیال کر اور شمس کی روشن کرنوں سے اپنے گھر کے آنگن کو منور کر لے۔"

پھر اس خوبصورت رات حسینہ نے اپنی زندگی کا خوبصورت فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے فیصلے پر شاد تھی۔ طرب و طمانیت کی لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی تھی۔ اسے طمانیت ملی تو اسے نیند آ گئی.... میٹھی نیند۔

پپو کے ہلانے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "ماں۔ ماں اٹھو.... دیکھو تو سہی گھڑیال صبح کے نو بجنے کا اعلان کر رہا ہے.... آج جمعہ ہے... میرا حلوہ پوری کھانے کا دن ہے... اٹھیں اور مجھے حلوہ پوری بنا کر دیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

حسینہ نے خوشی سے انگڑائی لی اور بولی "بیٹا' آج تو واقعی کافی دیر ہو گئی ہے.... میں جلدی سے ناشتہ بناتی ہوں.... لیکن تم بھی جلدی سے پی سی او جاؤ اور ابو کو فون کر آؤ کہ آج وہ ہمارے ساتھ آ کر ناشتہ کریں۔"

پپو نے متحیر ہو کر پوچھا "امی کون سے ابو..... کل ہی تو آپ نے کہا تھا کہ ابو مر گئے ہیں۔"

"ارے کون کہتا ہے کہ تیرے ابو مر گئے ہیں..... خیر سلا... تیرے تایا ابو زندہ ہیں۔ اللہ انہیں لمبی زندگی عطا کرے۔ چاند تاروں سے بھی زیادہ۔" حسینہ نے چمکتی دمکتی انکھیوں سے بیٹے کو بتایا۔

تایا ابو کا نام سنتے ہی پپو بھاگم بھاگ پی سی او پہنچا اور انکل کا فون ملایا۔

"ابو!"

ابو کی آواز پپو کی زبان سے سن کر آفتاب کھل پڑا۔ وہ خوش ہو کر بولا "ہاں بیٹا' خیر تو ہے؟"

"ابو سب ٹھیک ہے۔"

"تو پھر آج ہمارے پیارے بیٹے نے ہمیں کیسے یاد کیا؟"

"ابو آپ تو مجھے بہت یاد آتے ہیں.... آپ بہت پیارے ابو ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ لیکن تم بھی تو مجھ سے بہت پیار کرتے ہو۔"

"ہاں ابو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ فون کیوں کیا ہے.... کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ امی نے .... کہا ہے کہ آپ فی الفور ہمارے پاس آ جائیں اور ناشتہ ہمارے پاس آ کر کریں۔"

"بیٹا سچ کہہ رہے ہو؟" آفتاب نے خوشیوں کے سمندر میں ڈوب کر پوچھا۔

"ہاں ابو' آپ جلدی سے آ جائیں۔"

"اچھا بیٹا' میں پلک جھپکنے میں آیا۔"

"ابو پلک تو میں نے جھپک لی ہے.... لیکن آپ تو نہیں آئے۔"

"بیٹا پلک جھپکنے کا یہ مقصد تھوڑا ہے جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں فوراً تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" آفتاب نے ہنستے ہوئے پپو کو سمجھایا۔

"لیکن فوراً سے آپ کا کیا مطلب ابو.... مجھے تو گھنٹوں میں بتائیے۔"

"بیٹا تم باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو..... کہیں تمہاری امی خفا نہ ہو جائیں.... میں آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھا ابو' بائی۔"

آفتاب نے فوراً کپڑے بدلے..... گاڑی کی چابی لی' خوشی خوشی اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھا... ریورس گیر لگا کر اسے پورچ سے نکالا..... چند سو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کی گاڑی بندر روڈ پر پہنچ گئی اور پھر وہ ہوا کے دوش پر فراٹے بھرنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ گلشن اقبال پہنچ گیا۔

انجانے خیالوں کا پلاؤ پکاتے پکاتے اس نے کال بیل پر انگلی رکھی تو پل بھر میں دروازہ کھل گیا۔ حسینہ خوبصورت کپڑوں میں ملبوس کوہ قاف کی پری بنی سامنے کھڑی تھی۔ دونوں کی پیار بھری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ دونوں کے من میں خوشیوں کے چراغ جل

اٹھے۔ انگ انگ میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں شبنمی قطرے رقص کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے لیکن منہ سے آواز کسی کی بھی نہیں نکل رہی تھی۔ آفتاب تو حسینہ کے حسن کی ندیا میں مستغرق تھا۔ وہ اسے مرمر کا بت لگ رہی تھی۔ اس کی حسین نسواری آنکھوں میں بلا کا سحر تھا۔

حسینہ اپنے روشن آفتاب کی روشن آنکھوں میں پیار کا جگنو جھلملاتے دیکھ کر لجا سی گئی تھی۔ مورتی بن گئی تھی۔

معاً پپو ابو' ابو کہہ کر وہاں پہنچ گیا اور ابو کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آفتاب نے پپو کو اٹھا کر والہانہ انداز میں اس کو پیار کیا اور خوشیوں کو گلے لگائے اپنی حسینہ کے سنگ گھر کے اندر آگیا۔

حسینہ نے جھٹ سے ناشتہ ڈائننگ ٹیبل پر لگایا اور جادوئی انداز میں بولی "آیئے جانِ جاں.... ناشتہ کر لیجئے۔"

آفتاب تھوڑی دیر انجان بنا رہا۔ جیسے سنا ہی نہیں۔

حسینہ نے دوبارہ میٹھی آواز میں کہا "آفتاب صاحب آیئے نا..... پلیز آیئے نا۔"

آفتاب نے آنکھوں میں شوخیاں بھر کر مسکراتے ہوئے کہا "شکریہ۔" اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر گھر کے تینوں افراد ناشتہ کرنے لگے۔ آفتاب گاہے گاہے کن انکھیوں سے حسینہ کی طرف بھی دیکھ لیتا جو دلہن کا سنگھار کئے اس پر قیامت ڈھا رہی تھی۔

ناشتہ ختم ہوا تو پپو نے ماں سے اجازت لی "امی آج ہمارا کرکٹ میچ ہے.... کیا میں کرکٹ کھیلنے چلا جاؤں؟"

"ضرور بیٹا۔" حسینہ نے مسکرا کر اجازت دے دی۔

پپو ہاشم نے بلا اٹھایا اور جھومتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اب موقع غنیمت تھا۔ آفتاب نے شوخی بھری نگاہوں سے حسینہ کو دیکھا تو اس نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ وہ جھکی ہوئی آنکھوں میں اسے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ موم کی

گڑیا۔ آفتاب نے موم کی گڑیا پر اپنے قلب کی تپش کا وار کرتے ہوئے کہا۔

"حسینہ آج مجھ غریب کو کیسے یاد کیا ہے؟"

موم کی گڑیا جو آفتاب کی مخمور نظروں سے پہلے ہی پگھل رہی تھی' ملائمت سے بولی۔

"یہ جی...... یہ جی۔"

"ہاں... جانِ من... بولو تو سہی۔"

"آفتاب جی' میں ہار گئی۔ میں ہار گئی...... میں اس پاپی دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکی.... مجھے اس دنیا کے لچھنوں کا قطعی علم نہ تھا۔ میں ہوتق نہیں جانتی تھی کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں کھانے کے اور۔ آج میں جان گئی ہوں۔ میں جان چکی ہوں کہ عورت کی اپنے گُل چیں... گُل چیں کے بغیر کوئی وقعت نہیں۔ پھول' مرجھایا ہوا پھول۔ وہ بھی بن ڈالی اور خوشبو کے۔"

پھر وہ آنکھوں میں شبنمی قطرے سجائے مزید گویا ہوئی۔ "پلیز مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں پناہ دے کر مجھے ظلمی دنیا کی تمازت سے بچالو تاکہ میں بھسم ہونے سے بچ جاؤں اور زندہ رہ سکوں۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں.... اپنے ہاشم کے لئے... اپنے پپو ہاشم کے لئے...."

اس کے ساتھ ہی حسینہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

آفتاب نے تشفی دیتے ہوئے کہا "حسینہ فکر نہ کرو۔ میں عدّت گزرنے کے بعد تم سے دھوم دھام سے شادی کروں گا۔"

"نہیں' نہیں آفتاب نہیں۔" حسینہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" آفتاب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ میں تماشا نہیں بننا چاہتی.... دنیا والے ہنسیں گے... کہ دیکھو جی... جیٹھ سے شادی کر رہی ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا باتیں بنائیں۔" حسینہ نے اپنی دانشمندانہ رائے دی۔

"اری پگلی اگر ہم نکاح نہیں پڑھائیں گے تو پھر تو دنیا والے ہمارا جینا دوبھر کر دیں گے۔ وہ مختلف بہتان تراشیاں کریں گے۔" آفتاب نے فکر مند ہو کر کہا۔

"ہم دھوم دھڑکے کے بغیر بھی تو شادی کرسکتے ہیں۔ بالکل اسلامی رسم و رواج کے مطابق۔" حسینہ نے زیرِلبی تبسم سے کہا۔

"ٹھیک ہے.... جیسی تمہاری رضا۔" آفتاب نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔

حسینہ کی عدت ختم ہونے سے ایک ہفتہ قبل آفتاب نے پنجاب سے اپنے عزیز و اقارب کو بلوالیا اور عدت ختم ہونے کے ایک دن بعد حسینہ کو اپنی محبت کے حصار میں ہمیشہ کے لئے مقید کرلیا۔ رسمِ نکاح کے چند دن بعد آفتاب کے ابو بہادر خان نے اپنے نافرمان بیٹے کو عاق کردیا۔

لیل و نہار اپنی رفتار سے گزرتے رہے۔ لیکن آفتاب سے حسینہ کی گود ہری نہ ہوئی۔ اس کے برعکس دھیرے دھیرے اس کی صحت بگڑتی گئی۔ سال بھر میں وہ تنکا بن کر رہ گئی جو پھکنی سے پھونک مارنے سے اڑ سکتی تھی۔

آفتاب کو اپنے دل کی ملکہ کی بگڑتی صحت کی بہت فکر لاحق تھی۔ اس نے ہر معروف ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا لیکن اس کی صحت وحالت میں رتّی بھر افاقہ نہ ہوا۔ وہ اکثر پریشان حال ہو کر حسینہ سے بازپرس کرتا۔

"حسینہ بیگم۔ تمہیں کون سا غم کھائے جارہا ہے.... اگر تم بتاؤ تو میں تمہارے لئے آسمان سے تارے بھی توڑ کر تمہارے آنگن میں معلق کردوں.... تمہارے دل کے آنگن کو جھلملادوں۔"

"ارے میرے جانی۔ بھلا تمہاری جیسی عظیم ہستی کی موجودگی میں رنج و غم کو کیسے گلے لگا سکتی ہوں۔ میں ہوں ہی بدنصیب کہ جس کے آنگن میں نہ کبھی خوشیوں نے اجالا بکھیرا ہے اور نہ بکھیریں گی.... لگتا ہے کہ مجھے کوئی ایسی موذی بیماری لگ گئی ہے کہ جس کا ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل رہا.... یا میرا مرض لاعلاج ہے۔ اور ڈاکٹر بتاتے نہیں۔" حسینہ نے رنجور ہو کر کہا۔

"ہاں حسینہ، تم بالکل ٹھیک کہتی ہو.... ڈاکٹرز تمہارے مرض کی تشخیص نہیں کرسکے۔ اب ہمیں بزرگوں کے آستانوں پر جاکر خیرات مانگنی پڑے گی۔ ڈاکٹر رضا بھی کہہ رہے تھے کہ تمہیں دوا کی بجائے دعا کی ضرورت ہے۔" آفتاب نے روہانسا ہو کر کہا۔

"سرتاج، آپ کا آئیڈیا اچھا ہے۔ ہم کل ہی کسی خانقاہ پر جائیں گے اور جھولی پھیلا کر بھیک مانگیں گے۔" حسینہ نے مسکرا کر کہا۔

سب سے پہلے وہ دونوں اپنی مراد پانے کے لئے کلفٹن میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر گئے۔ مہینہ بھر وہاں جاتے رہے۔ وہاں سے مراد پوری نہ ہوئی تو شاہراہِ فیصل پر واقع پیر بخاری کے مزار پر جاتے رہے اور وہاں ہر جمعرات کو لنگر بھی پکواتے رہے۔ پھر منگھو پیر بھی گئے اور وہاں روایت کے مطابق منگھو پیر کے مگرمچھوں کو گوشت کھلاتے رہے۔ کہاوت ہے اگر مگرمچھ خوش ہوجائیں تو انسان کی مراد بر آتی ہے ورنہ نہیں۔

لیکن حسینہ کی گود ہری نہ ہوئی۔ لیکن حسینہ کی گود تو ہری ہونی ہی نہیں تھی۔ اس میں مشیتِ ایزدی بھی تھی لیکن زیادہ تر قصور حسینہ کا اپنا تھا.... وہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ اس کے بطن سے کوئی اور بچہ جنم لے۔ اس نے جس مرد سے محبت کی تھی اس نے بِنا خطا کے اس کے دل کو کرچی کرچی کردیا تھا.... اس نے حالات سے مجبور ہو کر ریزوں کو اکٹھا کرکے دل کے گلدان میں سجالیا تھا اور آفتاب سے شادی کرلی تھی۔ لیکن اس کا دل جڑ نہ سکا تھا۔ وہ بے حس بن چکی تھی۔ اسے حقِ زوجیت سے گھِن آتی تھی۔ بس آفتاب کی خوشی کی خاطر وہ کڑوا گھونٹ پی لیتی۔

بزرگوں کی چوکھٹوں پر بھی وہ آفتاب کی خوشنودی کے لئے جارہی تھی۔ ورنہ اسے نہ اولاد کی آرزو تھی اور نہ ہی جینے کی.... اس نے تو آفتاب سے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس لئے کہ اس کے مرنے کے بعد پپو کی زندگی میں کوئی خلا نہ آئے۔ دوسرے، وہ اپنی چھوٹی بہن .... کو تیار کرنا چاہتی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ آفتاب سے شادی کرلے۔

اس پلاننگ سے اسے دوہرا فائدہ تھا۔ ایک تو اس نے آفتاب کے احسانوں کا حساب چکانا تھا اور اسے اپنے سے بھی بڑھ کر چمکتا ہیرا اپنی بہن کے روپ میں تحفے میں دینا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے پپو کی زندگی اور مستقبل کو بھی درخشاں کرنا تھا۔

اگر وہ دور اندیشی سے کام نہ لیتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے والدین یا اس کی چھوٹی بہن اس لڑکے سے شادی کرنے پر آمادہ ہوتے جس کے بھائی نے ان کے گھر کی حور کو طلاق

دے دی تھی۔

ایک روز آفتاب غمناک لہجے میں گویا ہوا "بھورانی.... میرا دوست مونس کہہ رہا تھا کہ لیاری میں ایک پانی والا بابا ہے۔ اس کی دہلیز پر جو بھی قدم رکھتا ہے مراد پاتا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں بھی وہاں جانا چاہئے۔ ممکن ہے خداوند ہمارے بھاگ جگادے۔ کیا چلوگی؟"

"ضرور..... میرے سرتاج، ضرور چلوں گی۔" حسینہ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

دوسرے روز عشا کی نماز کے بعد وہ دونوں پانی والے بابا کے پاس پہنچ گئے۔ پانی والے بابا نے ایک چھوٹا سا کمرہ مخصوص کر رکھا تھا جہاں بعد نمازِ عشا تمام حاجت مندوں کو اس کا چیلا بٹھادیتا تھا پھر تقریباً رات نو بجے پیر سائیں حاضر ہوتے اور کمرے کی دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کی اپنی رازدار ضعیفہ چیخنا شروع کر دیتی۔ اس کی چیخیں دل ہلادینے والی ہوتیں۔

پانی والا بابا اس پر منتر پڑھ کر آسیب اتار دیتا اور جن سے وعدہ لے لیتا کہ وہ دوبارہ اپنی دلربا کو تنگ نہیں کرے گا۔ پھر وہ بوڑھی باہر چلی جاتی۔

اس کے بعد اس بوڑھی عورت کی دیکھا دیکھی ان حاجت مند عورتوں سے کوئی دوسری عورت چیخنا شروع کر دیتی۔ پھر پانی والا بابا اس پر بھی وہی عمل دہراتا اور آسیب زدہ عورت جن نکلوانے کے بعد باہر چلی جاتی اور باہر چیلے سے پانی کی بوتل لے کر اپنے گھر کی راہ لیتی۔ ہر مریضہ کو وہ پانی دوائی کی طرح پینا ہوتا تھا یعنی ایک چمچ صبح و شام... مریضہ چاہے وہ بیمار ہو.... آسیب زدہ ہو یا مراد مند ہو، یہ اس کی صوابدید پر منحصر تھا کہ چاہے ہفتہ کے بعد وہ پانی والے بابا سے نیا پانی لے لے یا پہلی لی ہوئی بوتل سے پانی استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ گھر سے اس میں مزید پانی ڈال کر اسے لبالب بھرا رکھے اور یہ لامتناہی سلسلہ اس وقت تک جاری رکھے جب تک اسے شفا نہ مل جائے۔

چند لمحات کے بعد پہلی آسیب زدہ عورت کی طرح دوسری عورت اپنے اوپر ویسے ہی آسیب زدگی کے آثار طاری کر لیتی اور پیر بابا اس کا آسیب اتارنے کا وہی طریقہ اختیار کرتا جو اس نے پہلی عورت کا جن اتارنے کے لئے کیا تھا۔ اس طرح اُس کا سلسلہ اس وقت تک

جاری رہتا جب تک آخری مریضہ یا مریض بھگت نہ جاتا۔

اس رات جب حسینہ پانی والے بابا کے پاس گئی تھی، وہی ڈرامہ رچایا گیا۔ باری باری سب مریض فارغ ہوگئے۔ صرف حسینہ رہ گئی جو ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آفتاب بھی بیٹھا تھا۔

دونوں پر خوف طاری تھا۔ وہ عورتوں کی چیخیں سن سن کر فروماندہ و مغموم تھے۔ سب آسیب زدہ عورتیں چلی گئیں اور حسینہ نے چیخنا چلّانا شروع نہ کیا تو پیر صاحب آفتاب سے متکلم ہوئے۔

"سائیں، لگتا ہے آپ کی بیوی کا جن بہت سخت ہے... تب ہی وہ ابھی تک حاضر نہیں ہوا۔"

"جی نہیں ایسا نہیں ہے.... میری بیوی آسیب زدہ نہیں ہے.... ہم تو آپ کے پاس اولاد کے لئے آئے ہیں۔" آفتاب نے متحیر ہو کر کہا۔

"اوہو تو یہ بات ہے۔"

پھر اس نے چیلے کو پکارا۔

"جی سرکار۔" چیلا سر جھکا کر بولا۔

"محترمہ کو پانی والی بوتل بھر دو اور انہیں سمجھا دو کہ کس طرح پانی کو دوائی کی طرح استعمال کرنا ہے۔"

"اچھا سرکار۔"

آفتاب نے پیر صاحب کو پچاس روپے کا نوٹ دیا اور پانی کی بوتل لے کر واپس آگئے۔

لیکن وہاں جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اس سے ان دونوں کا دل کھٹا ہوگیا۔ نہ حسینہ نے پانی پیا اور نہ آفتاب نے اسے پانی پینے کے لئے کہا اور نہ ہی بھولے سے وہ دوبارہ پانی والے بابا کے پاس گئے۔

بعد ازاں وہ سٹی اسٹیشن والا بابا، لالوکھیت کے سائیں بابا اور پٹھان گوٹھ کی پہنچ والی سیدانی کے پاس بھی گئے لیکن ان کی مراد بر نہ آئی۔

آخر میں وہ کبوتر والا بابا کے پاس گئے۔ کبوتر والے بابا کا طریقہ انوکھا تھا۔ وہ مریضہ سے تنہائی میں ملتا تھا اور مریضہ کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر کے اس کی عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیرتا۔

پھر اس بدنصیب مریضہ کو اپنا اور اپنے مستقل گاہکوں کا شکار بنالیتا اور گاہکوں سے بھاری قیمت وصول کرتا۔

حسینہ کبوتر والے بابا کے کمرے میں گئی تو کمرے کی تزئین و آرائش کو دیکھ کر انگشت بہ دنداں ہوگئی۔ پھر جب اس کی ہٹے کٹے پیر پر نگاہ پڑی تو وہ پریشان بھی ہوگئی۔ وہ لحیم شحیم اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔ "میری جان..... کیا سوچ رہی ہو..... آگے بڑھو اور میرے گلے لگ جاؤ اور اپنی مراد پوری کرالو۔"

"نہیں نہیں..... میں یہ مذموم فعل ہرگز نہیں کروں گی۔"

"اگر تم ایسا نہیں کرو گی، تو پھر..... خاوند تمہیں طلاق دے دے گا اور کسی دوسری عورت سے شادی کرلے گا۔"

"مجھے طلاق منظور ہے۔"

"تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

حسینہ تیزی سے اٹھی اور پلک جھپکنے میں باہر آگئی۔

"بابا سائیں نے تعویذ وغیرہ دیا ہے؟" آفتاب نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ میں تمہیں گھر چل کر بتاؤں گی۔" حسینہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

گھر آتے ہی وہ آٹھ آٹھ آنسو بہانے لگی تو آفتاب نے پراگندہ دل ہو کر پوچھا۔

"حسینہ رو کیوں رہی ہو..... پلیز بتاؤ نا۔"

"آفتاب! میں زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ میں اس بے رحم دنیا میں جینا نہیں چاہتی جس میں چاروں طرف بھیڑیے ہی بھیڑیے پھیلے ہوئے ہیں جو منہ کھولے کھڑے ہیں..... جونہی کسی بے کس عورت پر ان کی نظر پڑتی ہے تو وہ اسے دبوچ لیتے ہیں۔ وہ کبوتر والا بابا..... وہ بھی بھیڑیا ہے۔ وہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا لیکن میں اس کے منہ پر تھوک آئی ہوں..... ممکن تھا کہ وہ مجھے زبردستی اپنا شکار بنالیتا اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے اور اس کے کمرے کے باہر انتظار نہ کر رہے ہوتے۔"

حسینہ نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اب میری زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے..... میں مزید تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی۔"

معاً اس نے آہیں بھرنی شروع کردیں۔ آفتاب کا دل بھی مرجھا گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

تھوڑے توقف کے بعد حسینہ نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ "سرتاج میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تم پر بہت مظالم ڈھائے ہیں۔ مجھے معاف کردینا۔" پھر وہ رک گئی اور دھاڑیں مارنے لگی۔

آفتاب نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "میرے دل کی ملکہ۔ تم نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ تم تو وفاؤں کا پتلا بن کر میرے گھر میں رہی ہو..... تم سے تو مجھے کوئی گلہ و شکایت نہیں ہے۔"

"نہیں..... میں تمہاری قصوروار ہوں۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے۔ میں نے ہاشم کے درخشندہ مستقبل کی خاطر تم سے شادی کی لیکن تمہیں بیوی کا پیار نہ دے سکی۔ تمہیں پھول سا بچہ نہ دے سکی۔ مجبوراً وظیفۂ زوجیت ادا کرتی رہی لیکن ادھوری خوشی اور بدن کی غیر سنسنی خیزی کے ساتھ۔ اس لئے کہ میں دل میں قمر کے فروزاں دیپ کو بجھا نہ سکی۔ ایسے میں میرے بطن سے کیسے اولاد ہوتی۔ میں نے تمہاری امنگوں کا قتل کیا۔"

بولتے بولتے حسینہ کے تنفسی اعضا میں ٹھہراؤ آگیا۔ اس کی زبان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

آفتاب کی آنکھوں سے آنسو لڑی بن کر حسینہ پر گرنے لگے۔ آفتاب کے اشکوں کی تپش سے حسینہ کی ہمت پل بھر کے لئے بیدار ہوئی۔ وہ رک رک کر فریاد کرنے لگی۔

"آفتاب..... میری ڈاکٹر بنت حسنہ سے شادی کرلینا..... وہ ایسا چاند ہے جس کو دیکھ کر چاند

بھی شرماتا ہے۔ گلابی رنگت' صراحی دار گردن' جھیل نما آنکھیں' ستواں ناک اور سڈول جسم۔ اس سے شادی کر کے تم بے اولاد نہیں رہو گے۔ بے اولاد تو تم اب بھی نہیں ہو۔ میں تمہیں چاند جیسا بیٹا ہاشم تحفے میں دیئے جا رہی ہوں...... اسے بیٹا بنا کر ہی رکھنا ہے۔ اسے کبھی یہ احساس نہ ہو کہ تم اس کے حقیقی باپ نہیں ہو۔ میں نے اپنی حسنہ بہن کو بھی سمجھا دیا ہے۔ اسے تم سے شادی کرنے پر رضامند کر لیا ہے۔ کیا تم حسنہ سے شادی کرو گے' پو بیٹے کے درخشندہ مستقبل اور اپنی تابندہ زیست کی خاطر۔ شادی کرو گے نا.... پلیز بتاؤ نا.... میرے پاس وقت کم ہے.... پلیز بتاؤ بھی۔"

آفتاب نے روتے روتے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور حسینہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ آفتاب کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے حسینہ کے مرنے کی اطلاع تمام رشتے داروں کو بذریعہ فون و فیکس دے دی' ماسوائے قمر کے۔

O☆O

اُدھر لندن میں ایک روز موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ وقفے وقفے سے بادل بری طرح گرج رہے تھے۔ بجلی کا کوندا دفتر میں کام کرتی الزبتھ کے دل کو اتھل پتھل کر رہا تھا۔ وہ دل کو مسوس کر آفس سے باہر آئی۔ اس نے گرجتے بادلوں اور برستی بارش کی پرواہ نہ کی۔ تیزی سے پارکنگ لاٹ میں آئی' کار میں بیٹھی اور ایکسیلیریٹر دبا کر اسے گھر کی طرف بھگا دیا۔

سہمی و بھیگی وہ گھر میں وقت سے دو گھنٹے پہلے پہنچ گئی۔ اسے اُس کی بدبختی کہیں یا خوش قسمتی کہ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔

وہ انجانے وسوسوں میں گرفتار ہو کر دبے پاؤں سٹنگ روم میں داخل ہوئی تو اچانک اس کی نظر ملحقہ مارگریٹ کے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ اس کا سر گھوم گیا۔ وہ چکرانے لگی۔ اس کا جگر چھلنی ہو گیا۔ وہ زور سے چیخی۔

رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر مارگریٹ اور قمر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مارگریٹ ندامت کو گلے لگا کر ماسٹر بیڈ روم کی طرف بھاگ گئی جب کہ قمر ہاتھ جوڑ کر ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ "الزبتھ.... ہم سے بھولے سے غلطی ہو گئی ہے.... پلیز معاف کر دو۔"

الزبتھ انجانے خیالات کے پر لگا کر تیز ہوا کے دوش بدوش اڑ رہی تھی۔ اسے اپنی بدقسمتی پر رہ رہ کر رونا آ رہا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے ہوش بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے کہ اس کے کانوں میں قمر کی التماسانہ آواز پڑی۔ "بھولے سے غلطی ہو گئی ہے۔ معاف کر دو پلیز.... معاف کر دو الزبتھ۔"

قمر کی جھوٹ موٹ کی فریاد کو سنتے ہی الزبتھ ہوش میں آ گئی۔ اس کے آنسو بھی یکدم تھم گئے۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے قمر کو دیکھا اور زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر مار دیا پھر خشونت کی ہنڈیا میں ابلتے بولی "سفلے.... میری آرزوؤں کے قاتل.... مارگریٹ کی زندگی تباہ کرنے والے..... دفع ہو جا یہاں سے..... دفع ہو جا..... آئی ہیٹ یو.... نو مور ریلیشن ود یو....

آئی ڈائی وورس یو..... میں تجھے طلاق دیتی ہوں..... طلاق..... طلاق۔"

قمر کو گھر سے دفع کرنے کے بعد الزبتھ مارگریٹ کے پاس آئی جو اوندھے منہ لیٹی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر غموں کے جھولے میں ہچکولا لیتے ہوئے بولی۔ "میری ننھی بہن۔ میں نے ماں بن کر تیری پرورش کی۔ دنیا کی ہر آسائش تیرے قدموں میں ڈالی' تیری ہر خوشی کو اپنی زندگی کی تکیل بنا کر تیرے ہاتھ میں دے دی..... لیکن تو نے اپنی محسنہ بہن کو یہ صلہ دیا کہ اس کے گھر کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دی۔ آخر کیوں..... تو نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے۔"

پھر الزبتھ حقارت بھرے لہجے میں بولی۔" دیکھو تو سہی مسلمانوں کے انوکھے کرتوت۔ اٹھتے بیٹھتے اسلام ..... اسلام ازم کا ڈھنڈورا پیٹتے پیٹتے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں' لیکن عیش و عشرت کے حمام میں سب ننگے ہیں..... قمر کو ہی دیکھو۔ اس نے کتنا نیچ کام کیا ہے۔ سالی بہن ہوتی ہے..... لیکن اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بہن کی عصمت کے دامن کو تار تار کر دیا۔ ہش۔ ایسے فرد..... اور ایسی قوم پر........ قول بھی سرور آمیز اور فعل بھی سحر انگیز۔"

فردِ جرم سنانے کے بعد الزبتھ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ مارگریٹ ہمت کر کے اٹھی اور الزبتھ سے مضحکہ خیز انداز میں بولی "بہن' میں نے کون سا جرم کیا ہے۔ کیا محبت کرنا گناہ ہے۔ آخر میں بھی جوان ہوں..... میرے بھی کچھ ارمان ہیں..... کیا میں اس چکاچوند دنیا میں نہیں بستی جہاں شب و روز عیاشیوں و خوشیوں کو گلے لگایا جاتا ہے۔ آپ نے ماں بن کر میری پرورش ضرور کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کی باندی بن جاؤں۔"

الزبتھ نے اپنی بہن کی زہریلی باتیں سنیں تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ متاسف ہو کر کہنے لگی "مارگریٹ' یہ تیرا قصور نہیں ہے... یہ مغربی معاشرے کی کارستانی ہے کہ بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں رہا۔ قریبی رشتوں کا پاس نہیں رہا۔ یہ ہمارے کلچر کا کرشمہ ہی تو ہے کہ تم نے بہنوئی کے ساتھ منہ کالا کرنا مناسب سمجھا جب کہ اس جگمگاتی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک وجیہہ مرد موجود ہے۔"

مارگریٹ نے تاؤ میں آکر کہا "ہاں ہاں' مرد تو بہت ہیں اور میں نے بہت ہی حسین لڑکوں سے عشق بازی بھی کی ہے مثلاً جاوید' جمشید' جان وغیرہ۔ جان تو مجھ پر جان بھی نچھاور کرنے

کے لئے تیار رہتا ہے۔ میں بھی اس سے پیار کرتی ہوں۔"

پھر اس نے روہانسی ہو کر کہا "حیف صد حیف۔ ان میں سے کوئی بھی میرے جذبات کو سمجھ نہ سکا۔ یا ان میں میرے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ پھر مجھے گھر کا بھیدی مل گیا۔ قمر کی شکل میں۔ قمر نے میرے من کی آگ کو بجھایا اور مجھ سے ٹوٹ کر پیار کیا۔ میں بھی جاوید وغیرہ کو بھول گئی۔ خصوصاً جاوید میری سرد مہری پر پریشان رہتا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتا ہے... مارگریٹ تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم مجھے لفٹ کیوں نہیں کراتیں...... اور میں اترا کر دامن جھٹک لیتی ہوں۔ اس لئے کہ اب مجھے جاوید کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے گھر کی چار دیواری میں سب کچھ مل گیا جس کی مجھے ضرورت تھی....."

مارگریٹ نے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیلا کر مزید کہا "قمر تمہیں طلاق دینے پر آمادہ ہے..... پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کر کے ہمیشہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ میں نے ٹھیک کہا ہے نا الزبتھ جانی...... تمہیں افسوس تو ضرور ہو گا لیکن مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد اس غم کو بھول جاؤ گی۔ پھر تمہارے آنگن میں کوئی نہ کوئی چاند اتر کر محبت کے اجالے کی کرنیں بکھیر دے گا۔"

نادان بہن کی معصوم باتیں سن کر الزبتھ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ گویا ہوئی۔ "اری نادان تمہارے منہ پر ناک نہیں رہی...... تم محبت میں اندھی ہو چکی ہو۔ اس لئے تم اس حقیقت کو پلّو میں باندھنے سے قاصر ہو... کہ جو مرد تمہاری بہن سے نہ نبھا سکا... وہ عمر بھر تمہارا کیسے رہ سکتا ہے۔ جب تمہاری جوانی دیوانی میں ذرا سا ٹھہراؤ آ جائے گا اور قمر کو کوئی اور حسین و جمیل دوشیزہ مل جائے گی تو پھر تمہیں بھی وہ ٹھکرا دے گا۔"

مارگریٹ بھی تلخ لہجے میں بولی "سسٹر صاحبہ' تم میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں سرو قد' دل فریب تن' پُرکشش چہرے اور کافرانہ اداؤں کی مالک ہوں۔ جب کہ تم میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قمر مجھے کبھی نہ ٹھکرا سکے گا... میں اپنی دلربائی و زیبائی کی بنا پر اس کے دل پر راج کروں گی راج۔"

الزبتھ نے رنجور ہو کر کہا "بہن' میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ میں تمہیں سمجھاتی بھی نہ

اگر میں نے ماں بن کر تمہاری پرورش نہ کی ہوتی۔ مجھے اپنے لگائے ہوئے پودے کے بِن پھل دیئے سوکھ جانے پر بہت دکھ و رنج ہے۔ کاش تم میرے کہنے پر عمل کر کے اس چلتری ببول سے اپنے دامن کو بچا سکتیں..... شاید تمہارے بخت میں کانٹوں سے اپنے دامن کو تار تار کرنا لکھا ہے۔ لیکن تم پر میری پندو نصائح کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ تم جس معاشرے میں رہ کر جوانی کی دہلیز پر پہنچی ہو وہ معاشرہ ہی لچر ہے۔ اس ننگے کلچر میں بہن بھائی اور محرم و غیر محرم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ہر ایک نے نفسا نفسی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اپنی ضرورت و مسرت کی خاطر دوسرے کی امنگوں کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ چاہے شکار اس کا بہت ہی قریبی قرابت دار ہو۔ حیف صد حیف تفریح گاہوں میں کھلّم کھلاّ عیاشی ہوتی ہے۔ ننگ دھڑنگ سمندروں میں نہانا ہماری ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ والدین اور بہن بھائی کی موجودگی میں محبت کی پینگیں بڑھانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ننگِ خلائق فنکشنز خصوصاً کرسمس وایسٹر کو الیکٹرونک میڈیا پر دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ایسے معاشرے کی جڑیں تو کھوکھلی ہوں گی ہی.... ایسے میں تم جیسی نا سمجھ لڑکیوں کا بھول بھلیّوں کی سحر طرازیوں کو گلے لگانا معتوب و معیوب نہیں ہوتا۔ قصہ کوتاہ' میری پند کی پھلجھڑیاں بجھنے کو ہیں۔ کاش تم ان سے اپنے من کو فروزاں کر سکتیں۔"

بجھی ہوئی پھلجھڑیوں پر قدم رکھتے ہوئے الزبتھ اپنے کمرے کو چل دی۔ چلتے چلتے وہ رکی اور مڑ کر مارگریٹ سے کہا "اگر کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو مجھے بلا تامّل یاد کر لینا۔ اور یہ بھی سن لو..... میں نے قمر کو اپنی زندگی سے ایسے نکال دیا ہے جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ اب تمہارے لئے راستہ بالکل صاف ہے۔ جیسا تمہارا من کہے ویسا ہی کر لینا....."

الزبتھ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی اور آٹھ آٹھ آنسو بہانے لگی جبکہ مارگریٹ مسرور ہو کر ساری رات مدھر دھنوں پر ڈسکو گانے سنتی رہی۔

رنگے ہاتھوں پکڑے جانے اور طلاق ملنے کے بعد قمر دل گرفتہ جہاز پر پہنچا' یہ جان کر اس کی جان میں جان آگئی کہ بوجوہ پاکستانیوں کے جہاز کی ہینڈلنگ اور سیر مونیٹل پریڈ میں تین ماہ کا

اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح قمر کے لندن کے قیام میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ مسرور تھا کہ اس اضافی عرصہ میں وہ مکمل طور پر مارگریٹ کو اپنے جال میں پھانس لے گا۔

چند دنوں کے بعد کچھ آفیسرز اور سیلرز نے برطانیہ کے قیام میں تین ماہ کا اضافہ ہونے کے طفیل امریکا جانے کا پروگرام بنایا تاکہ وہاں کی سیرو سیاحت کی جا سکے۔ قمر بھی ان جوانوں میں شامل تھا۔ سیرو سیاحت و عیاشی تو اس کی گھٹی میں شامل تھی۔ بھلا وہ کیوں ایک سنہری موقعہ ہاتھ سے نکلنے دیتا۔

چند دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد پاکستانی ملاحوں کو امریکا کا ویزا مل گیا اور قمر اپنے دیگر من چلے ساتھیوں کے ساتھ مارگریٹ کو انفارم کئے بغیر امریکا چلا گیا۔

مارگریٹ بھی فرحاں تھی۔ قمر سے الزبتھ کے تعلقات ٹوٹ جانے پر اس کے دل کی کلی کھِل اٹھی تھی۔ اب قمر کو اپنانے میں اس کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ وہ اس سے کورٹ میرج کر سکتی تھی۔ اب وہ سنہرے سپنوں کا لبادہ اوڑھ کر ہواؤں میں اڑنے لگی اور اڑتے اڑتے اپنے سوہنے پکھیرو کے آنے کا انتظار کرتی۔

حسبِ معمول مارگریٹ صبح اٹھتی۔ ناشتہ کرتی اور الزبتھ کو بائی بائی کر کے کالج چلی جاتی۔ الزبتھ ان دنوں گھر میں رہ کر آرام کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ امید سے تھی اور اس نے رخصت برائے زچگی لے رکھی تھی۔

وہ اپنی بھولی بہن کو کالج جانے کے وقت کھلتے ہوئے پھول کی طرح رخصت کرتی اور اس کے جانے کے بعد دیر گئے تک خدا کی بارگاہ میں عجزو انکسار کے ساتھ اس کے راہِ راست پر آنے کی دعائیں مانگتی رہتی۔

ہفتہ عشرہ گزر گیا لیکن قمر نے مارگریٹ کی کوئی خبر نہ لی تو وہ وسوسوں اور اندیشوں کے دام میں گرفتار ہو کر نیول بیس گئی تاکہ اس کی عافیت اور اس کے نہ ملنے کی وجہ سے آگاہی حاصل کر سکے۔

نیول بیس پہنچ کر اسے پتا چلا کہ وہ امریکن ایمبیسی گیا ہے تاکہ وہ امریکا کی سیرو سیاحت کرنے کے لئے ویزا اور ضروری کاغذات بنوا سکے۔

مارگریٹ یہ جان کر کہ قمر اس کو بتائے بغیر ہی امریکا جا رہا تھا، مضمحل و پژمردہ ہو گئی۔ شجر سے گرے ہوئے زرد پتے کی طرح اجڑی اجڑی واپس آ گئی۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مارگریٹ ایک دفعہ پھر جہاز پر گئی تو یہ جان کر کہ قمر تو امریکا جا چکا ہے، اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی لڑی بندھ گئی۔ وہ مفلوک الحال گھر پہنچی۔ میڈ سرونٹ مریم نے اسے لرزتے بدن اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ دیکھا تو وہ سہارا دے کر اندر لے آئی اور رنجور ہو کر پوچھنے لگی۔ "مارگریٹ کیا بات ہے۔ تمہارا بدن ایسا ہو گیا ہے جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔"

"ہاں' ایک رذیل نے میرا خون نچوڑ لیا ہے۔"

"وہ بدذات کون ہے؟" مریم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ایڈیٹ قمر ہے۔" مارگریٹ نے خشونت سے کہا۔

"اوہ! کیا تو یہ وہی قمر ہے جس نے الزبتھ کا گھر اجاڑا ہے؟" مریم نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" مارگریٹ نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک روز الزبتھ نے اپنی جان گسل داستان سنائی تھی۔ وہ تمہارے لئے فکر مند تھی اور دعا گو تھی کہ گاڈ اس کی بہن کی زندگی اس بھیڑیئے سے بچا لے۔" مریم نے بتایا۔

"میری بہن کی دعا تو پوری ہو گئی ہے لیکن میرا سب کچھ لٹنے کے بعد۔" مارگریٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"میری بہن..... گریٹ بہن..... کہاں ہے۔" مارگریٹ نے پوچھا۔

"سوری' یہ تو میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ دو گھنٹے پہلے مالکن میٹرنٹی ہوم گئی تھیں۔ تمہارے گھر آنے سے چند لمحات پہلے ادھر سے فون آیا تھا۔ الزبتھ کے بطن سے بچی تولد ہوئی ہے۔ گول مٹول سی بچی۔"

"آہا..... تم نے کتنی روح افزا خبر سنائی ہے۔ فرطِ مسرت سے میرا رُواں رُواں جھوم رہا ہے۔"

مارگریٹ نے فرطِ مسرت سے مریم کو چوم لیا۔ وہ جلدی سے گھر سے باہر نکلی اور ٹیکسی

ہائر کر کے ہاسپٹل پہنچ گئی۔ استقبالیہ سے بہن کا کمرہ پوچھا اور ہانپتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بچی کو اٹھایا اور والہانہ انداز میں نومولود کو چومنے لگی۔

الزبتھ اپنی بہن کو والہانہ انداز سے بھانجی کو چومتے دیکھ کر خوشی سے پھڑک اٹھی۔ وہ آنکھوں میں موتی سجائے چہکی۔ "مارگریٹ ویلکم..... یو آر گریٹ۔"

"نہیں الزبتھ..... میں گریٹ نہیں..... تم گریٹ ہو۔" مارگریٹ نے مچل کر کہا اور بہن کا ماتھا چوم لیا۔

پھر وہ ملتجیانہ انداز میں بولی "گریٹ سسٹر' میں نے تمہیں بہت غم دیئے ہیں..... میں نے تمہارے دامن کو کانٹوں سے بھر دیا..... میں تمہاری خطاوار ہوں۔ میں ایک مکار مرد کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر پھسل گئی تھی۔ میں گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ ابھی حالات کے زینے سے باہر نکلی ہوں۔"

مارگریٹ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اس کے گالوں سے آنسو لڑھک کر ننھے سے جاندار لوتھڑے پر پڑے تو وہ بھی رونے لگا۔

الزبتھ نے روہانسی ہو کر کہا "مارگریٹ پلیز' گریہ و زاری مت کرو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔ آج تمہاری بھانجی کا جنم دن ہے۔ آج تو خوشیاں مناؤ۔"

"ٹھیک ہے میں خوشیاں مناؤں گی لیکن ایک صورت میں۔" مارگریٹ نے ملتجی ہو کر کہا۔

"وہ کون سی صورت ہے؟" الزبتھ نے چاہت بھرے انداز سے پوچھا۔

"وہ صورت یہ ہے کہ آپ میری نوزائیدہ بھانجی کے صدقے مجھے معاف کر دیں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

الزبتھ کا دل بھی پھٹنے لگا۔ اس نے نحیف آواز میں کہا "مارگریٹ' آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

مارگریٹ کے بیٹھتے ہی الزبتھ نے اپنی بہن کو گلے لگا لیا اور آنکھوں میں موتی سجائے بولی۔

"مارگریٹ تم تو میری بیٹی ہو..... مریم سی' پیاری سی بیٹی..... بھلا ماں بھی کبھی اپنی بیٹی سے

ناراض ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں..... تم تو میرا دل ہو..... میری جان ہو۔"

مارگریٹ جب اپنی عظیم بہن کے سینے سے لگی تو سینے کی گرمائش سے اس کا غم اڑ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ پھر وہ فرطِ مسرت سے فضاؤں میں قہقہے بکھیرنے لگی۔

اس کی ٹھٹا مار ہنسی کو سن کر نرس اندر آ گئی اور متحیر ہو کر بولی "یہ محترمہ کیوں ہنس رہی ہیں؟"

"پیاری نرس' ہنسنے پر بھی کبھی پابندی لگ سکتی ہے۔ ہنسی ہنسی ہوتی ہے۔ یہ رک نہیں سکتی.... آج میری بہن بھانجی کو پاکر خوش ہے.... آج اسے ہنسنے سے نہ روکو۔ اسے خوب ہنسنے دو۔"

نرس بھی خوش ہو کر چلی گئی اور کچھ دیر قہقہے لگتے رہے۔ مارگریٹ خوشی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں نہاتی رہی۔ جب وہ بحرِ تخیلات سے باہر نکلی تو بہن و بھانجی کو والہ وشیدا ہو کر چوما اور زچہ گیریاں کرنے لگی۔

امریکا میں بھی قمر نے جی بھر کر رنگ رلیاں منائیں اور دلربا نظاروں سے آنکھوں کو سرور بخشا۔ اسے یونیورسل اسٹوڈیو بہت پسند آیا۔ وہاں اس نے ایک فلم کی شوٹنگ بھی دیکھی۔ پھر اس نے ایک سندر سی لڑکی کو پھانس لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک روز بیٹھے بیٹھے اس کا دل گھبرایا تو وہ ساحلِ سمندر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر وہ امواجِ تلاطم سے کھیلنے لگا۔

پھر کھیلتے کھیلتے اور چلتے چلتے وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک قمروش دوشیزہ ریت پر عریاں لیٹی سورج کی کرنوں سے غسل کر رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی قمر کو ایسے لگا جیسے کہ اس کے قدم ریت میں دھنس گئے ہوں۔ حسنِ فرنگ کے جسم کی حشر سامانیوں سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں' دل بے قابو ہو گیا۔

وہ ڈوب کر حسن آرا کی فسوں طرازیوں کو دیکھنے لگا۔ جادوگرنی اپنے خیالات میں مگن تھی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ کوئی دل پھینک اسے دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اس نے اپنے نزدیک کسی کے آنے کی چاپ سنی۔

پھر وہ پیٹ کے بل لیٹ گئی۔

قمر کے لئے اس کا مرمریں و جادو نظر جسم نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر نعمت

کے مست انگیز برہنہ جسم کو دیکھتا رہا۔ وہ دم بخود ہو گیا۔

حسینۂ عالم نے کروٹ لی تو سامنے ایک اجنبی کو بت بنے دیکھا تو وقتی طور پر وہ جھنجلا سی گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ انگریزی میں ذرا تلخی سے بولی۔

"ہو آر یو..... ہے تم کون ہو اور مجھے چیر پھاڑ جانے والی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

جب قمر مٹی کا پتلا بنا کھڑا رہا اور منہ سے کچھ نہ بولا تو بجلی اٹھی اور گرج کر بولی۔

"آر یو ڈیف؟ کیا تم بہرے ہو..... بولتے کیوں نہیں۔"

بجلی کی بجلی بھری آواز نے قمر کے سہانے خواب کو جلا کر بھسم کر دیا۔ وہ سٹپٹا کر صرف اتنا بول سکا "ہیں..... ہوں۔"

چند ثانیے کے بعد اس نے اپنے سامنے بجلیاں برساتی حسینہ کو تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے اس کے کشادہ سینے کے زیروبم کو دیکھا تو اس کے جسم میں بجلی دوڑنے لگی۔ وہ بے خود ہو کر بولا "پریوں کے دیس کی پری۔ تم چودھویں کا چاند ہو۔ تم بے شک منہ بنائے رکھو اور مجھے اجنبی سمجھ کر اجنبیت کی بدلی کے پیچھے چھپی رہو۔ لیکن جانتی ہو چاند کا کیا کام ہے۔ اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں سے دوسروں کو منور کرنا۔ میں بھی تم سے ضرور منور ہوں گا۔"

پھر قمر نے اپنی چشموں میں محبت کے چراغ جلائے اپنی بات کو یوں بڑھایا "جانِ جہاں' کیا محبت کرنا جرم ہے۔ اگر ہے تو پھر مجھے اپنی تیغِ ناز سے قتل کر دو۔ میں تمہاری محبت کے سمندر میں ڈوب چکا ہوں..... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

"ریئلی..... واقعی؟" حسینہ جس کا نام میری تھا' وہ قمر کی مخمور آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور بڑھ کر قمر کے گلے لگ گئی۔

قمر کی جانِ جاں موم کی طرح پگھل کر ریت پر بیٹھ گئی تو قمر بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور چاہت بھرے انداز میں بولا۔ "میری' تم بے وقت ساحل پر کیسے آ گئیں۔"

"اگر یہی بات میں تم سے پوچھوں تو؟"

"دراصل میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں سمندر کی طرف بھاگا تا کہ سمندر کی لہروں سے کھیل

کردل کو دھڑکنے سے بچا سکوں۔"

قمر نے محبت کا جال دوبارہ پھینکا تاکہ اسے اپنی پیاسی آرزو کا نشانہ بنا سکے۔

"قمر' عین بعین میرے دل کی حالت بھی خراب ہوگئی تھی تو میں بھی ادھر کو آنکلی۔ دل کو بہلانے کے لئے ریت پر لیٹ گئی اور ریت سے کھیلتی رہی اور پھر قسمت نے تم سے ملادیا۔ تمہارے سحر نے مجھے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح جھکا دیا۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسی لئے تو ہم دونوں ساحلِ سمندر پر آگئے۔" قمر نے بے خود ہو کر کہا اور اسے گدگدی کرتے ہوئے گلے لگالیا اور پھر... پھر جھکی ہوئے ڈالی سے پکے ہوئے کیف انگیز پھل کو توڑ کر کھالیا۔

فلک تو ان کے بے فصل پیار پر شبنم افشانی کر رہا تھا جب کہ سمندر کی لہروں میں تلاطم آگیا۔ وہ لپک لپک کر قمر اور میری کے اجسام مرمریں کو چومتیں اور پلٹ آتیں۔ پھر دونوں جانبین بپھری ہوئی لہروں کا زور ٹوٹ گیا۔

لہریں بھی سمندر میں پلٹ گئیں اور قمر و میری بھی ٹھنڈے ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

میری امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اسے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ وہ لیل و نہار قمر کے ساتھ تفریحی مقامات پر گھومنے پھرنے میں گزارنے لگی۔ وہ اپنی شیورلیٹ کار میں قمر کو ہالیڈے ہوم سے جہاں وہ رہتا تھا' پک کرتی اور نیویارک کے دلچسپ مقامات پر لے جاتی اور دلچسپیوں اور رعنائیوں سے خود اور قمر کو بھی مستفیض کرتی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ وہ دل کھول کر اپنی پاکٹ سے اس کے لئے خرچ کر رہی تھی۔ اس طرح قمر کو تو قارون اور قلب دونوں کا خزانہ مل گیا تھا۔

آخر میں وہ اسے بفیلو شہر لے گئی۔ اس نے اسے جھیل ایری اور جھیل انٹیریو دکھائی۔ دونوں جھیلوں کو ملانے والا دنیا کا معروف نیاگرا آبشار دکھایا۔ وہ اسے کینیڈا بھی لے گئی تاکہ جھیل نیاگرا کا وہ حصہ جو کینیڈا میں پڑتا ہے اور دیگر تفریحی مقامات کو دیکھ لیا جائے۔

درحقیقت جھیل ایری' جھیل انٹیریو اور نیاگرا آبشار کے ایک طرف (شمال مشرق

کینیڈا ہے اور دوسری طرف امریکا ہے۔ امریکا کے شہر بفیلو سے آپ نیاگرا آبشار کو دیکھنے کے لئے جاسکتے ہیں۔ یہ شہر جھیل ایری پر واقع ہے اور نیویارک اسٹیٹ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ صنعتی شہر ہے اور واشنگٹن ڈی سی سے ۲۰۰ میل اور شکاگو سے ۹۰۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

بفیلو سے وہ ٹورانٹو گئے جو جھیل ایری کی دوسری طرف کینیڈا میں واقع ہے۔ ٹورانٹو سے وہ کینیڈا کے دارالخلافہ اوٹاوا اور وہاں سے مانٹریال گئے۔

مانٹریال کینیڈا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر میں صنعتوں کا جال بچھا ہے۔ یہ دارالخلافہ اوٹاوا سے مشرق کی طرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

مانٹریال میں قمر اور میری نے رائل پہاڑ جو سات سو فٹ اونچا ہے' رائل پارک' میوزیم آف فائن آرٹس' اولمپک پارک' انڈر گراؤنڈ شاپنگ مالز اور دیگر تفریحی مقامات کو جی بھر کر دیکھا اور خوب انجوائے کیا۔ مانٹریال سے وہ واپس اوٹاوا پہنچے اور وہاں سے کینیڈا کا پُربہار سفر ختم کر کے نیویارک سٹی پہنچ گئے۔

اس کے ساتھ ہی قمر کا نیویارک شہر کی سیروسیاحت کا عرصہ بھی ختم ہوگیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لندن آنے کے لئے کینیڈی انٹرنیشنل ائرپورٹ پہنچا تو میری کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ اپنے دوست کے بچھڑ جانے پر بہت ملول و مغموم تھی۔ اس کی جھیل نما آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب تھا۔ قمر اس کو مسلسل تشفی دے رہا تھا۔ "جانِ من' صبر کرو... ہم چند ہفتوں میں جہاز کو لے کر پاکستان پہنچ جائیں گے۔ پھر میں چھٹی لے کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور اپنی خوبصورت ملکہ کو اپنی زندگی کے مضبوط ہالے میں جکڑ لوں گا۔ ٹھیک ہے نا ڈارلنگ؟"

میری فرطِ غم کی بنا پر کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر جدائی کے لمحات آن پہنچے تو اس نے بھیگی آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے دل جانی کو گڈ بائی کہا۔

قمر نے لیورپول پہنچتے ہی میری کو فون کیا اور اسے سمجھاتا رہا کہ وہ ہمت' قناعت اور استقامت کا لبادہ اوڑھ کر اس کا انتظار کرے۔

دوسرے روز وہ ایک کیفے ٹیریا میں مضمحل بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک جوان نے اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میرا نام جاوید ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ اگر مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی تو تم بھی پاکستانی لگتے ہو.... ایم آئی رائٹ؟"

"یس۔" قمر نے مختصر سا جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو.... میرا مطلب ہے کہ پاکستان میں کہاں رہتے ہو؟"

"پنڈدادن خان۔ ضلع جہلم۔"

"آہا۔ تم تو میرے گاؤں کے نکلے.... میں بھی پنڈدادن خان کا رہنے والا ہوں۔"

جاوید نے بڑھ کر قمر کو گلے لگالیا۔ پھر فرطِ مسرت سے بولا۔ "قمر تم یہاں لندن میں ہی کیوں سکونت اختیار نہیں کرلیتے؟"

"میں پاکستان نیوی میں چیف پیٹی آفیسر ہوں۔ جب تک مجھے ڈسچارج نہ ملے۔ میں کیسے لندن رہ سکتا ہوں۔"

"بھئی ڈسچارج لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت تو ہے۔ ورنہ وہ مجھے پکڑ کر جیل میں بند کردیں گے۔"

تھوڑی سوچ بچار کے بعد جاوید نے کہا۔ "وہ تمہیں جیل میں تو تب بند کریں گے جب تم پکڑے جاؤ گے۔"

"ارے پگلے جاوید۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ جب میں رات کو جہاز پر رپورٹ نہیں کروں گا اور دوسرے دن بھی.... تو پھر تیسرے دن کے اخبار میں شہ سرخی کے ساتھ میرے بھگوڑے ہونے کی رپورٹ چھپی ہوگی۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے کونا کونا چھاننے لگ جائے گی۔ میں لاکھ چھپوں گا پھر بھی یہاں کی مستعد پولیس سے نہ بچ پاؤں گا۔"

"لیکن ہم تمہارے سی او کو پولیس کو رپورٹ کرنے کا موقعہ ہی فراہم نہیں کریں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے.... تم کہہ رہے تھے کہ تمہارا جہاز ۳۰ دسمبر کی صبح کو پاکستان کے لئے لنگر اٹھائے گا.... تو تم ایسا کرنا کہ ۲۹ دسمبر کو باہر گھومنے کے لئے آؤ تو پھر واپس نہ جانا.... جہاز کا

متعلقہ عملہ صبح تک تمہارے آنے کا انتظار کرے گا۔ پھر تمہیں یہیں چھوڑ کر پاکستان کے لئے روانہ ہوجائے گا۔ پھر وہ پاکستان پہنچ کر تمہارے ڈزرٹر ہونے کی اطلاع برٹش پولیس کو کریں گے یا تمہیں بغیر پنشن کے ڈسچارج کردیں گے۔"

تھوڑے توقف کے بعد جاوید نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں بھی دس سال پہلے بطور ایم ای نیوی میں کام کرتا تھا.... میں نے بھی ایسے ہی کیا..... الحمدللہ اب میں زرومال کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ آج تک کسی نے نہ مجھے پکڑا اور نہ ہی تلاش کیا۔"

"خوب لیکن اگر میں تمہارے مشورے پر عمل کرتا ہوں تو پھر میں سر کہاں چھپاؤں گا۔ میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے نوکری کہاں کروں گا..... مجھ بھگوڑے کو کون ملازم رکھے گا' بنا تنخواہ تو بھوکا مرجاؤں گا۔ پھر یہ مثال مجھ پر صادق آئے گی کہ آسمان سے گرا تو کھجور میں اٹکا۔ نیول سروس اور پنشن بھی ختم اور بھوک کی موت بھی۔"

جاوید ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولا "گرائیں نوکری کی تو فکر ہی نہ کرو۔ یہاں لیورپول سے ۳۰ میل دور مانچسٹر ہے۔ وہاں میری اپنی گارمنٹ فیکٹری ہے۔ میں کیسے گارمنٹ فیکٹری کا مالک بنا' اس کے پیچھے الگ داستان ہے۔ کبھی موقع ملا تو سناؤں گا۔ میرا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ میں تمہیں فورمین کی حیثیت سے اپنی فیکٹری میں رکھ لوں گا۔ فورمین کی تنخواہ اتنی زیادہ ہے کہ تم اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں ڈوبی ہوئی محسوس کروگے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" قمر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

جاوید نے قمر کی رضامندی پاکر اسے گلے لگالیا اور دوسرے دن اسے اپنے گھر مانچسٹر شہر آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اس کا گھر اور کاروباری پوزیشن دیکھ سکے۔

دوسرے دن قمر اس کے گھر گیا۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھی تو جاوید نے دروازہ کھولا۔ وہ قمر کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ اسے بانہوں میں لے کر خوشی خوشی گھر کے اندر لے آیا اور فرطِ مسرت سے چہک کر بولا "اری بیگم رانی' دیکھو تو سہی کون آیا ہے۔"

جاوید کی بیگم رابعہ نے جاوید کو دیکھا تو بولی "گڑیا کے ابو' میں کیا جانوں۔ بتاؤ گے تو پتا

چلے گا۔"

"اری بھلی مانس، یہ قمر ہے جس کا ذکر کل میں نے تم سے کیا تھا اور جس کے لئے تم نے آج طرح طرح کی مرغن ڈشیں پکائی ہیں۔"

"ہائے میں مرجاواں.....میں چھوٹے بھیا کو پہچان نہ سکی۔ بھیا مجھے معاف کر دینا..... ٹھیک ہے چھوٹے بھیا۔"

قمر نے کھل کر بھابی کو سلام کیا اور جواب میں رابعہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں دوسرے کمرے سے گڑیا بھی بھاگ کر باہر آگئی اور انکل انکل کہہ کر قمر سے لپٹ گئی جیسے کہ وہ پہلے ہی اس سے مانوس ہو۔

قمر نے بھی پیار سے گڑیا کو اٹھایا اور اس کے گلابی گالوں کو چوم لیا۔ پھر ان چاروں نے مل کر کھانا کھایا جیسے کہ وہ ایک ہی گھر کے افراد ہوں۔

○☆○

امریکا سے واپس آئے مشکل سے پندرہ دن ہی گزر پائے ہوں گے کہ قمر کو مارگریٹ کی یاد ستانے لگی۔ بلاشبہ اس کی امریکن محبوبہ میری، مارگریٹ کے مقابلے میں بہت حسین تھی لیکن وہ اس سے کوسوں دور تھی۔ اسے تو اپنے دل کو بہلانے کے لئے کسی پری کی ضرورت تھی اور وہ پری مارگریٹ کی شکل میں برمنگھم میں موجود تھی جو اس سے صرف ۹۸ میل دور تھی۔

اُس نے اس کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے فوراً فون کیا۔ شومئ قسمت فون الزبتھ نے اٹھایا "ہیلو ہیلو آئی ایم الزبتھ اسپیکنگ۔" الزبتھ کی آواز سن کر قمر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

دوسرے دن قمر نے پھر فون کیا۔ خوش قسمتی سے فون مارگریٹ نے اٹھایا۔ "یس مارگریٹ دس سائڈ۔"

"ہیلو مارگریٹ، گڈ مارننگ.....میں قمر بول رہا ہوں۔" قمر نے خوش کن لہجے میں کہا۔

مارگریٹ نے بی شیم کہہ کر فون رکھ دیا۔

اس نے کئی دفعہ مارگریٹ کو فون ملایا لیکن ہر دفعہ اسے زک اٹھانی پڑی۔ پھر مارگریٹ بھی اس سے تنگ آگئی۔ لیکن ایک دن جب اس کا فون آیا اور اس نے گڑگڑا کر استدعا کی۔

"ڈیر مارگریٹ صرف ایک دفعہ مجھ سے ملو.....پلیز صرف ایک دفعہ۔"

تو اُس نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے حقیقت سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھا۔

اس نے فون پر تمسخرانہ انداز سے جواب دیا "قمر، اب تم سے ملنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ میں تعلیم سے فارغ ہو چکی ہوں۔ میں نے کیسینو (Casino) میں ملازمت کرلی ہے۔ چند روز میں میری اپنے باس رابرٹ سے شادی ہو جائے گی۔"

پھر مارگریٹ نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا "اس کے باوجود اگر تم مجھ سے ملنے کو ترس

رہے ہو تو آج ہی رات جو! گھر میں آجاؤ۔ چند منٹ تم سے باتیں بھی کرلوں گی اور تمہیں اپنے ہونے والے شوہر سے بھی ملوادوں گی۔ اگر تم آج نہ آسکو تو دو دن کے بعد پندرہ تاریخ کو آجانا..... پندرہ تاریخ کو میں اور رابرٹ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں گے۔ اگر چاہو تو تمہیں شادی کا دعوت نامہ بھیج دوں اور ہاں' ایک بات اور سن لو..... الزبتھ کے ہاں ایک گول مٹول سی بچی نے جنم لیا ہے جو گوری چٹی اور ازرق چشم ہے لیکن بال کالے ہیں۔"

"کیا کہا.... الزبتھ کی کوکھ سے بیٹی ہوئی ہے۔ بیٹی .... میری بیٹی۔" وہ ہذیانی کیفیت میں بولا۔

مارگریٹ تمسخرانہ انداز میں ہنسی "ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی ضرور ہے لیکن اب کبھی تم اس کی شکل نہ دیکھ پاؤ گے۔ بھول جاؤ پرانی باتوں کو.... بھول جاؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" پھر مارگریٹ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے دوبارہ طنزیہ تیر چھوڑا۔ "میں اپنی شادی کا دعوت نامہ آج ہی تمہیں پوسٹ کردوں گی۔ پلیز شادی میں ضرور شرکت کرنا۔"

لیکن مارگریٹ کو قمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس کا ریت پر بنا ہوا محل مسمار ہوچکا تھا۔ وہ دل گرفتہ ہو کر فون رکھ چکا تھا۔

ایک تیرہ و تار رات قمر الزبتھ کے فلیٹ کی طرف چل دیا۔ فلیٹ کے قریب پہنچا تو اس نے کافی دیر انتظار کیا لیکن لفٹ تھی کہ نیچے آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ پریشان کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے الزبتھ کے پاس پانچویں منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔

واہ ری قسمت لفٹ نیچے نہیں آرہی تھی۔ شائد کوئی فنی خرابی ہوگئی تھی۔ اب اس کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جائے۔ اس سے پہلے وہ کئی بار سیڑھیوں کے ذریعے الزبتھ کے اپارٹمنٹ میں گیا تھا۔ لیکن اس دن اُس کا دل رنجیدہ تھا۔ وہ خوف و غم کے امتزاج میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ الزبتھ کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہوگا۔ اسی خوف کے سبب اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ لہٰذا وہ اوپر جانے کے بجائے سامنے گھاس پر بیٹھ گیا۔

اللہ اللہ کر کے قمر نے ایک گھنٹہ انتظار کیا۔ تب کہیں لفٹ نیچے آئی۔ ایک فربہ جسم والا آدمی اوزار اٹھائے لفٹ سے باہر نکلا۔ اسی اثنا میں قمر بھی لفٹ کے پاس پہنچ گیا۔ موٹا باہر نکلتے ہی قمر سے گویا ہوا "ساری ینگ مین۔ لفٹ چوتھے فلور پر خراب ہو کر رک گئی تھی۔ چونکہ اس میں نقص کچھ زیادہ تھا اس لئے پورا سوا گھنٹہ اس کے ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔"

"نوپرابلم۔ جنٹلمین۔" قمر نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

قمر لفٹ میں داخل ہوا اور پانچویں منزل کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ بسرعت اوپر جانے لگی۔ اس کا دل بھی لفٹ کی رفتار کی مناسبت سے دھک دھک کرنے لگا۔ اسے خوف لاحق تھا' وہ سوچ رہا تھا کہ کیا الزبتھ اس سے ملنا پسند کرے گی۔ کیا وہ اسے اپنی بیٹی سے ملنے دے گی وغیرہ وغیرہ۔

لفٹ اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ وہ لفٹ سے باہر نہ نکلا تو باہر کھڑی ادھیڑ عمر عورت نے ذرا تلخی سے کہا۔ "ہے' کیا لفٹ سے باہر نہیں آؤ گے۔" پھر وہ لفٹ کے اندر داخل ہوگئی۔ اس نے اُس کے شانوں کو جھنجوڑ کر کہا "مسٹر کیا سوچ رہے ہو۔ لفٹ پانچویں منزل پر پہنچ چکی ہے۔"

قمر سٹپٹا گیا اور جلدی سے باہر نکلتے ہوئے بولا "ساری میڈم! ویری ساری۔"

"نیور مائنڈ۔" ادھیڑ عمر عورت نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

قمر دبے پاؤں الزبتھ کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا اور لرزتے ہاتھوں سے اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک قوی و قمروش جوان نے دروازہ کھولا اور قمر سے آنے کا مقصد پوچھا۔

قمر نے حوصلہ کر کے بمشکل لبوں کو کھولا "میں الزبتھ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوکے' کم اِن۔" وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے حقارت آمیز لہجے میں آواز دی "الزبتھ کوئی ایشیائی جوان تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

الزبتھ آناًفاناً ڈرائنگ روم میں آگئی۔ قمر کو بیٹھا دیکھ کر اس کے تن من میں آگ لگ گئی۔ وہ غرا کر بولی۔ "ایڈیٹ' دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے

ہوئی۔"

قمر الزبتھ کے چلّانے پر پریشان و حیران ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور پژمردگی میں بولا۔ "الزبتھ فار گاڈ سیک۔ میری بات تو سنو۔"

الزبتھ غصے سے چلّائی "میں کوئی بات وات سننا نہیں چاہتی۔ اگر اپنی زندگی کی سلامتی چاہتے ہو تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ گیٹ آؤٹ۔"

قمر انکساری سے بولا "الزبتھ مجھ پر اتنا احسان کرو۔ مجھے نومولود بیٹی تو دکھا دو۔"

الزبتھ تمسخرانہ انداز میں گویا ہوئی "وہ میری بیٹی ہے..... کان کھول کر سن لو..... وہ میری بیٹی ہے، تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔" پھر الزبتھ نے تحکمانہ انداز سے کہا "گیٹ آؤٹ فرام ہیر۔"

لیکن جب قمر پر اس کے تحکم کا کوئی اثر نہیں ہوا تو الزبتھ نے جوزف سے کہا۔

"ڈیئر ہسبنڈ اس منحوس و خبیث آدمی کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

جوزف جان گیا کہ قمر اور الزبتھ کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ وہ حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ جب الزبتھ نے اسے دھکے دے کر قمر کو باہر نکالنے کے لئے کہا تو وہ مکروہ ہنسی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے قمر کو بازوؤں سے پکڑ کر زور سے جھنجوڑا اور دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بک بھی رہا تھا۔

"باسٹرڈ نے میری محبوبہ کی زندگی برباد کر دی اور اب ہم دونوں کی لازوال محبت میں دراڑیں ڈالنا چاہتا ہے۔"

کشتی بان جو دو کشتیوں میں سوار رہنے کا خوگر تھا، وہ کشتیوں کو جلا بیٹھا۔ الزبتھ تو پہلے ہاتھ سے نکل چکی تھی پھر مارگریٹ نکل گئی۔

اب الزبتھ کے ناروا سلوک پر اس کا دل بھی جل اٹھا۔ دل کے جلنے کے ساتھ اس کا دماغ بھی ماؤف ہو گیا۔

وہ بڑی مشکل سے لفٹ میں آیا۔ لفٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک خاتون کے فون کرنے پر پولیس وہاں پہنچ گئی۔ پولیس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی

تو ان کے ہاتھ اس کا نیوی کا آئی ڈی کارڈ لگا۔ انہوں نے اسے پولیس وین میں بٹھا کر نیول بیس پہنچا دیا۔

جب قمر کو ہوش آیا تو وہ اپنی بدبختی پر بے حد مغموم و پراگندہ ہوا۔ اس کے بعد وہ لگاتار رنجور رہنے لگا۔ کیونکہ اُن دنوں انڈیا نے مشرقی پاکستان پر دھاوا بول دیا تھا۔ مغربی میڈیا پاکستان کے متعلق شکستہ دل رپورٹیں دے رہا تھا۔ ہر آئے دن اسے منحوس خبر سننے کو ملتی۔

"انڈین فوجیں ایڈوانس کر رہی ہیں..... پاکستانی فوج میں کوئی دم خم نہیں..... ڈھاکہ ائرپورٹ تباہ کر دیا گیا ہے..... پاکستانی ائرفورس ناکارہ ہو گئی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔"

پھر ۱۶ دسمبر کا منحوس دن بھی آ پہنچا جس روز اسے پاکستان کے دولخت ہونے کی جگر خراش خبر سننے کو ملی..... وہ دوسرے ہموطنوں کی طرح نہایت مغموم و نادم تھا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو چکا تھا۔ وہ شرم کے مارے دوسری اقوام کے باشندوں کا سامنا کرنے سے بھی کتراتا تھا۔

پاکستان آدھا ہونے کے سبب آمدنی کے وسائل بھی کم ہو گئے۔ آمدنی بھی کم ہو گئی لہٰذا پاکستان اتنی بڑی فوج کے اخراجات کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا علاقہ کم ہو جانے کے سبب فطری طور پر پہلے جتنی فوج کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا نیول ہیڈ کوارٹر سے تمام اسٹیبلشمنٹس کو آرڈر دیا گیا۔ "اگر کوئی سیلر یا آفیسر رضاکارانہ طور پر نیوی چھوڑنا چاہتا ہے تو وہ اپنا نام سی او کو دے دے۔"

قمر اپنی باوفا بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکا تھا۔ باپ نے اسے منقولہ و غیر منقولہ جائداد سے عاق کر دیا تھا۔ غرضیکہ پاکستان میں وہ اپنی زندگی کے سفینے کو پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے ڈبو چکا تھا۔ برمنگھم میں بھی اس کے پیار کی کہانی دفن ہو چکی تھی۔ نہ پاکستان میں وہ اپنے بیٹے اور نہ برمنگھم میں وہ اپنی بیٹی کا منہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اولاد کے ہوتے ہوئے بے اولاد تھا۔

لے دے کے ایک مُیری کا سہارا رہ گیا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اور وہ بھی مُیری کی شکل میں۔ جو حسینۂ عالم اور جانِ جہاں تھی۔ جس کے گلابی بدن اور شربتی آنکھوں سے پھوٹنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں دیکھنے والے کے دل کو منور اور ذہن کو مدہوش کر دیتیں۔

مزید برآں جاوید نے بھی اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا قمر نے نیول ہیڈ کوارٹر کے

حوصلہ آمیز سرکلر کو غنیمت گردانتے ہوئے اپنے سی او سے ڈسچارج منظور کرالیا۔

پاکستان پہنچنے پر قمر نے جہاز کو چھوڑ دینا تھا۔ لیکن وہ اتنے دن تک انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پاکستان جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے جاوید کی بتائی ہوئی اسکیم پر عمل کیا۔ وہ ایک دن پہلے برٹی پر باہر آیا اور رات کو جہاز پر نہ گیا۔ جہاز صبح آٹھ بجے پروگرام کے مطابق پاکستان کے لئے سیل کر گیا۔

چونکہ قمر کا ڈسچارج پہلے ہی منظور ہو چکا تھا۔ اس لئے قمر کا وارنٹ گرفتاری نہیں نکالا گیا۔ صرف ایک چیز کا نقصان اسے ضرور اٹھانا پڑا۔ وہ یہ کہ وہ نیول ہیڈ کوارٹر بنفسِ نفیس جاتا اور پنشن منظور کرالیتا۔

قمر نے جاوید کی گارمنٹ فیکٹری جوائن کرلی اور محنت' دلچسپی و لگن سے کام کرنے لگا۔ نیول سروس کا تجربہ بھی اس کے کام آیا اور وہ جاوید گارمنٹ فیکٹری کا چھنّے خان سمجھا جانے لگا۔

جاوید نے اس کے کام سے متاثر ہو کر اسے فورمین کے عہدے پر ترقی دے دی۔ کچھ عرصے کے بعد اسے اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنالیا۔ جب کبھی جاوید کو کسی کاروبار یا کسی اہم کام کے سلسلے میں مانچسٹر سے باہر جانا پڑتا تو فیکٹری کی نگرانی قمر کرتا۔

مانچسٹر میں قمر کے وارے نیارے ہوگئے۔ پوزیشن منیجر کی اور تنخواہ بھی معقول۔ پیسے کی ریل پیل ہونے سے وہ ہر روز میری کو فون کرتا اور اسے مانچسٹر آنے اور سیٹل ہونے کی التماس وغیرہ کرتا۔ جبکہ میری ہر دفعہ اسے یہی کہتی "جانی تم امریکا.... آجاؤ اور یہاں سیٹل ہوجاؤ۔ اس سے ہمیں دوہرا فائدہ ہوگا۔ ایک تو میں اپنے ملک میں ہی رہ سکوں گی دوسرے تمہیں بھی امریکا کی نیشنیلٹی مل جائے گی۔"

پھر وہ ہنستے ہنستے کہتی "بائی داوے قمر کیا تم اپنی ملکہ میری کے لئے ایک غیر دیس نہیں چھوڑ سکتے۔ جب کہ جس ملک میں تم رہائش پذیر ہو اس ملک کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم نے تو تاج کو بھی ٹھوکر ماردی تھی اور ملک بھی چھوڑ دیا تھا۔"

قمر اور میری کے درمیان آنے جانے کی تکرار کا سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا۔ ایک روز

جاوید نے قمر کو مشورہ دیا "قمر' ہم نے پندرہ روز کے لئے فیکٹری بند کرنی ہے۔ کیونکہ کچھ ضروری مینٹی نینس کا کام کروانا ہے۔ تم پندرہ روز کے لئے امریکا چلے جاؤ۔ میری سے شادی کرلو اور اسے کونس کرکے یہاں لے آؤ۔ ممکن ہے شادی کرنے کے بعد وہ تمہاری بات مان لے۔"

جاوید کی مسرت آمیز رائے کو سن کر قمر کی بے تاب آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگانے لگے۔ وہ مسرور ہو کر بولا "ٹھیک ہے جاوید' میں کل ہی عازمِ امریکا ہو جاؤں گا۔"

قمر نے اسی وقت میری کو امریکا آنے کی اطلاع دی اور دوسرے روز وہ نیویارک پہنچ گیا۔ اس نے خوشی خوشی امیگریشن کی کارروائی مکمل کروائی اور خراماں خراماں ائرپورٹ سے باہر آگیا۔

باہر قدم رکھتے ہی اس کی بے تاب نگاہ میری پر پڑی تو اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ میری بھی اپنے جانی کو دیکھتے ہی دوڑتے دوڑتے اس کے قریب پہنچ گئی۔ چند ثانئے دونوں نے ایک دوسرے کو چمکتی آنکھوں اور مچلتے دل کے ساتھ دیکھا پھر دونوں گلے لگ گئے۔

میری کا بنگلہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ میری نے اپنی لمبی کار میں قمر کو فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کی اور ایکسیلیریٹر دبادیا۔ کار فرّاٹے بھرنے لگی۔ دونوں خوشیوں سے سرشار ہو کر گھر پہنچے۔

سب سے پہلے قمر نے غسل کیا۔ در آں اثنا میری نے کھانے کی میز کو قسم قسم کی کھانے کی ڈشوں سے سجادیا اور پھر دونوں نے پُرلطف لنچ کیا۔

لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ کورٹ گئے اور کورٹ میرج کرلی۔ اسی روز وہ ہنی مون منانے مانٹریال چلے گئے۔ وہاں تین روز تک وہ پانچ ستاروں والے ہوٹل میں رہے اور دنیاوی و روحانی سحر طرازیوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔

مانٹریال سے وہ ٹورانٹو گئے۔ وہاں بھی انہوں نے فائیو اسٹار ہوٹل میں بکنگ کرائی۔ وہاں بھی انہوں نے قلبی خوشیوں کو گلے لگانے کے علاوہ خوبصورت تفریح گاہوں خصوصاً نیاگرا

آبشار کے نظاروں سے دل و دماغ کو سیراب کیا۔

کنیڈا میں ہنی مون منانے کے بعد وہ نیویارک واپس لوٹ آئے۔ ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی قمر مچل کر بولا "ڈارلنگ ماہِ عسل تو ہم نے کنیڈا منالیا۔ لیکن ماہِ نوشین کی آخری گھڑیوں کو اگر ہم وہاں منائیں جہاں ہم نے پیار کیا تھا.... دل کو سکون بخشتا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے سمندر کے کنارے اور ریت کے بستر پر؟"

"ہاں مُیری ہاں۔"

"تو پھر چلو' پہلے ادھر چلتے ہیں.... پھر گھر جائیں گے۔"

پھر وہ ساحل پر گئے اور پرانی یاد کو تازہ کرکے ماہِ عسل کی سنہری رنگینیوں سے فیضیاب ہوئے۔ دوسرے دن قمر برطانیہ واپس آگیا لیکن آنے سے پہلے نیویارک ائرپورٹ پر اس نے عاجزانہ لہجے میں مُیری سے یہ ضرور کہا "مُیری' اب ہم ایک دوسرے سے جدا نہ رہ سکیں گے۔ خدا کے لئے اپنی ضد کو چھوڑ دو اور برطانیہ میں رہائش اختیار کرکے میرے پیاسے دل کے آنگن کو خوشیوں سے منور کردو۔"

مُیری نے مغموم لہجے میں جواب دیا "قمر' تم سمجھتے کیوں نہیں ہو.... میں تم پر مرتی ہوں تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو..... تم میری پہلی محبت ہو.... میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی لیکن اپنے پیارے دیس امریکا کو چھوڑنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

مُیری نے شوخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "قمر یوکے تمہارا اپنا ملک تو نہیں ہے۔ تمہیں مانچسٹر چھوڑ کر نیویارک آنے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہارے لئے تو نیویارک جنت ہے۔ جس میں تمہاری حور رہتی ہے۔ تمہاری حور کا محل ہے۔ تم محل کی حسین زندگی کی بجائے کاشانہ میں کیوں رہنا پسند کرتے ہو۔ ارے تم برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی ایڈورڈ ہشتم کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکتے' جس نے اپنی محبوبہ کی خاطر تخت و تاج کو چھوڑ دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا۔" قمر نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"کوشش نہیں... بلکہ تمہیں جلدی نیویارک آنا ہوگا.... جنت کے لئے ... اپنی حور کے

لئے۔" مُیری نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

"اوکے جانِ من۔" قمر نے کہا اور بائی بائی کرکے بوجھل قدموں کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوگیا۔

واپس پہنچ کر قمر کا مُیری کے بغیر دل اداس رہنے لگا۔ اس کی کمی اسے بری طرح کھٹکتی۔ وہ اپنے دل کو لگام ڈالنے کے لئے روزانہ اسے فون کرتا۔

ایک روز جاوید نے قمر سے کہا "قمر آؤ ائرپورٹ چلیں۔"

"کس لئے؟" قمر نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کے دل میں دھچکا سا لگا۔ "ہو سکتا ہے کہ مُیری آرہی ہو۔"

"بھئی آج میری ماں اور میری چھوٹی بہن تقریباً ایک سال پاکستان میں رہنے کے بعد واپس انگلینڈ آرہی ہیں۔" جاوید مسکرا کر بولا۔

"پھر تو میں ضرور تمہارا ساتھ دوں گا۔" قمر نے خندہ روی سے کہا۔

جہاز بوجوہ ایک گھنٹا لیٹ ہوگیا۔ اللہ اللہ کرکے جہاز نے صبح ۱۰ بجے لینڈ کیا اور رن وے پر دوڑنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی امیگریشن کی کارروائی کے بعد جاوید کی ماں اور اس کی بہن غزالہ ائرپورٹ سے باہر نکلے۔ جاوید بڑھ کر ماں اور بہن سے باری باری گلے ملا۔ قمر نے فقط سلام کرنا ہی مناسب سمجھا۔ غزالہ کی آنکھیں خوبصورت ایشیائی جوان قمر سے ٹکرائیں تو اس نے خوش ہو کر بھیا سے پوچھا "بھیا' یہ صاحب کون ہیں؟"

"یہ صاحب قمر ہیں۔" جاوید نے ہنس کر جواب دیا پھر اس نے ماں اور بہن سے تعارف کراتے ہوئے کہا "ماں' یہ میرا گرائیں ہے۔ یہ میری فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اس نے میرے کاروبار کو مختصر عرصے میں اتنا چمکا دیا ہے کہ میں نے خوش ہو کر اسے منیجر بنا دیا ہے۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں.... یعنی ہم ایک سائبان تلے اکٹھے رہتے ہیں۔"

جاوید کی ماں نے قمر کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور غزالہ کا دل کھل گیا جو طلاق ملنے کے بعد مرجھا گیا تھا۔ اس کے من میں یہ فرحت آمیز خیال سا آگیا کہ ضرور بھیا نے قمر کو میرے لئے پروپوز کر رکھا ہوگا۔ تب ہی تو وہ اجنبی پر اتنے مہربان ہوگئے ہیں کہ انہیں منیجر کے

عہدے پر ترقی دے دی ہے۔

غزالہ کا من بحرِ فرحت میں مسرت سے ناچ رہا تھا۔ اسے امید بندھ گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ قمر میرے دل میں اتر کر میرے من میں اجالا بکھیر دے۔

"اری غزالہ کہاں کھو گئی ہو.... آؤ کار میں بیٹھو۔" جاوید نے غزالہ کے کان کو دباتے ہوئے کہا۔

غزالہ نے سٹپٹا کر کہا "ہیں...." پھر وہ اپنی نادانی پر ہنسی اور چپکے سے کار میں بیٹھ گئی۔

شوہر سے طلاق ملنے کے بعد غزالہ ہر وقت افسردہ رہتی تھی۔ اس نے کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے ماں اسے کچھ نہ کچھ زبردستی کھلا دیتی تھی۔ غزالہ کی غمناک حالت پر سب پریشان رہتے تھے۔ جاوید کی تجویز پر ماں اسے پاکستان لے گئی تھی تاکہ اس کا دل بہل جائے اور وہ اپنے خاوند کے مظالم کو بھول جائے۔

اب جب کہ غزالہ ایک سال کے بعد واپس انگلینڈ پہنچی تو اس کے چمن میں بہار لوٹ آئی تھی۔ سہانے خیالات کی مہک نے اس کے افسردہ دل کو مہکا دیا تھا۔ وہ مہک و چہک کر ہر لحہ گنگناتی رہتی اور جب کبھی تنہائی میں اس کی ملاقات قمر سے ہو جاتی تو وہ دل کھول کر اس سے باتیں کرتی جبکہ قمر صرف مسکرا کر اس کی باتوں کا جواب دے دیتا لیکن محبت کا اظہار نہ کرتا کیونکہ وہ تو ہر وقت اپنی بیوی مَیری کے خیالوں میں مگن رہتا۔

لیکن ایک روز آسمان پر ابر تیرہ چھایا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ غزالہ نہ جانے گھپ اندھیرے کو دیکھ کر کیوں پریشان تھی کیونکہ وہ تو بادلوں کو مچلتے دیکھتی تو خود بھی مچل جاتی تھی اور ابرِ رحمت کے انتظار میں موسیقی کی مدھر دھنوں پر رقص کرتی تھی۔ لیکن آج اس کا دل خوف کے مارے دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں جاوید کے کمرے کی طرف لپکی تو اندر سے قمر اور بھیا کی آواز سن کر وہ دروازے کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ پھر جب اس نے قمر کو یہ کہتے سنا "جاوید بھائی میں ہار گیا ہوں۔ مَیری جیت گئی ہے۔ اب میں ہمیشہ کے لئے انگلینڈ چھوڑ رہا ہوں..... اب میں امریکا میں مَیری کے ساتھ ہی رہوں گا۔" تو آسمان پر بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہی حال غزالہ کا بھی ہوا۔ برقِ خاطف سے اس کی

آنکھیں چندھیا گئیں۔ درد سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے رم جھم پھوار برسنے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ لرزتے دل اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر اوندھے منہ گر گئی اور اپنی بدبختی پر آہ و فغاں کرنے لگی۔

○☆○

کراچی میں حسینہ کے دم توڑ جانے کی خبر سن کر پنجاب سے تمام رشتہ دار بشمول آفتاب اور حسینہ کے والدین لُٹے لُٹے، بکھرے بکھرے کراچی پہنچ گئے تھے۔ دور کے رشتے دار تو چند دن رہنے کے بعد واپس چلے گئے لیکن آفتاب اور حسینہ مرحومہ کے والدین چند دنوں کے لیے رک گئے تاکہ اپنے بیٹے آفتاب اور اپنے غموں کو ہلکا کر سکیں۔ مزید برآں ان کی خواہش تھی کہ حسینہ کے چہلم کے بعد ہی جائیں گے۔

حسینہ کے چہلم پر مجلس اور قرآن خوانی کرائی گئی اور اس کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ چہلم کے تیسرے دن آفتاب نے ملائمت سے حسینہ مرحومہ کی ماں سے کہا۔

"چچی جان! اگر آپ برا نہ منائیں تو یہاں میرے پاس ہی رہ جائیں۔ آپ کی موجودگی سے ہاشم کو امی کی یاد بھی نہیں ستائے گی کیونکہ وہ آپ سے کافی مانوس ہو گیا ہے۔ دوسرے ہمارا گھر سونا سونا بھی نہیں لگے گا..."

حسینہ مرحومہ کی امی نے مٹھاس بھرے لہجے میں جواب دیا "بیٹا میرا یہاں رہنا مشکل ہے... بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ میرا حسنہ کے ساتھ رہنا اشد ضروری ہے۔ وہ لاہور میں اکیلی رہ رہی ہے۔ پھر جوان ہے..... اور اس ظلمی دنیا میں جہاں ہر طرف بھیڑیئے منہ کھولے کھڑے ہوں..... وہاں عورت اور وہ بھی جوان عورت کا اکیلے رہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔"

تھوڑے توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "جیسا کہ تم جانتے ہو کہ حسنہ ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ اس کی شہرت کا ڈنکا پاکستان کے گوشے گوشے میں بج رہا ہے۔ اسے ان دنوں کراچی کے ایک معروف ہسپتال میں سروس کی آفر ہوئی ہے جس کے جواب میں حسنہ نے کچھ اپنے مطالبات پیش کیے ہیں۔ اگر وہ منظور ہو گئے تو پھر ہم ماں بیٹی دونوں کراچی آجائیں گے.... ٹھیک ہے نا بیٹے۔"

"لیکن اس وقت تک میں منے کو کیسے سنبھالوں گا؟" آفتاب نے پریشان ہو کر کہا۔

"بیٹا، منا ہمارا بھی تو بیٹا ہے..... ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" حسنہ کی اماں نے ہنس کر کہا۔

"اماں جانی۔ یہ نہیں ہو سکتا.... میں ہاشم کے بغیر پل بھر بھی نہیں رہ سکتا۔" آفتاب نے غمزدہ ہو کر کہا۔

"تو پھر بیٹا میں بھی مجبور ہوں۔" حسنہ کی امی نے غمگین ہو کر جواب دیا۔

پھر آفتاب نے قسمت آزمائی کرتے ہوئے اپنی امی سے بھیک مانگی "امی جان، آپ ہی ہمارے پاس رہ جائیے نا ہاشم کے لیے۔"

امی جان کا بھی جواب نفی میں تھا۔ "بیٹا میں نے تو قبر میں ٹانگیں لٹکا رکھی ہیں... کچھ پتا نہیں کب میری آنکھیں بند ہو جائیں۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہارے ابو کا ساتھ چھوڑ دوں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میں تمہارے ابو کے ہاتھوں میں مروں۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور حسرت بھی۔ دوسرے میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ حسینہ کی طرح مجھے کراچی میں دفنا دیا جائے اور مجھے اپنی مٹی میں دفن ہونے کے لیے دو گز زمین بھی نہ ملے۔ مجھے اپنی مٹی سے بہت پیار ہے۔"

"اماں جیسی آپ کی مرضی۔" آفتاب نے رنجور ہو کر کہا۔ پھر اس نے ان کی موجودگی میں ہی ہاشم کی پرورش و نگہداشت کے لیے ایک عمر رسیدہ عورت کو ملازمہ رکھ لیا۔

ننھے منے ہاشم کی اللہ نے سن لی۔ پندرہ دن ہی مشکل سے بیت پائے ہوں گے کہ اس کی خالہ حسنہ اور نانی کراچی آگئیں اور اس کے ساتھ رہنے لگیں۔ حسنہ نے ہسپتال جوائن کر لیا۔ چند روز کے اندر اس نے ایک نئی کار خرید لی اور ڈرائیور بھی رکھ لیا جو اسے ہسپتال چھوڑ آتا اور لے بھی آتا۔

آفتاب، ہاشم، حسنہ اور حسنہ کی امی کے دن بڑی خوشی کے ساتھ گزر رہے تھے۔ ایک ماہ گزرنے میں دیر نہ لگی۔ ایک ماہ ہی گزر پایا تھا کہ آفتاب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بھلا وہ صبر بھی کیسے کرتا۔ حسنہ ہو بہو اپنی بڑی بہن پر گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کہ وہ اس کی جڑواں

بہن ہو۔ رنگ بھی چٹا اور ڈیل ڈول بھی دل ربا۔ اگر کچھ فرق تھا تو بالوں کا۔ حسینہ کے بال تراشے ہوئے تھے اور حسنہ کے بالوں کا لچھا کمر کمر تک آتا تھا۔

آفتاب نے جھجکتے جھجکتے حسنہ کی امی سے لب کشائی کی۔ "خالہ جان۔ میں حسینہ مرحومہ کی خواہش کو تعبیر کا لبادہ پہنانے کا آرزومند ہوں۔"

"اس بیچاری کی کون سی خواہش تھی۔ وہ تو اپنی ادھوری تمنا اپنے ساتھ ہی لے کر چلی گئی ہے۔" خالہ نے متحیر ہو کر کہا۔

"خالہ جان.... خالہ جان۔"

"ہاں بیٹا شرماؤ نہیں.... بولو تو سہی...... کچھ بولو تو۔"

"وہ یہ.... کہ میں حسنہ سے شادی کر کے ہاشم کو ماں کا پیار دلا دوں۔" آفتاب نے لجاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا.... حسنہ کو آنے دو۔ میں اس سے پوچھ کر تمہیں جواب دوں گی۔ جہاں تک میری مرضی کا تعلق ہے تو میں حسینہ اور تمہاری خواہش پر واری جاؤں.... اگر ایسا ہو جائے تو یہ ہمارے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی۔" خالہ نے مسرور ہو کر کہا۔

حسنہ حسبِ معمول خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئی۔ ماں اور آفتاب کو سلام کیا اور ہاشم کو اٹھا کر چومنے لگی۔

حسنہ کی امی نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے یوں لب کشائی کی "بیٹی میں چاہتی ہوں کہ تمہیں دلہن بنا کر ان گنت خوشیوں کو گلے لگا لوں۔"

خالہ کی فرحت آمیز گفتگو سنتے ہی آفتاب وہاں سے کھسک گیا تا کہ ماں بیٹی آزادی سے مسرت بھرے موضوع پر گفتگو کر لیں۔

"اماں جانی۔ میں زندگی بھر شادی کے چکر میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں مسیحائی کے ارفع مقام پر پہنچ کر خلقت کی خوب خدمت کروں لیکن میں نے اپنی خواہش کو مٹی میں دفن کر دیا۔ باجی کی تمنا کے احترام میں.... باجی نے مرنے سے دو ہفتے پہلے فون کر کے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کی موت کے بعد میں آفتاب سے شادی کر لوں اور

ہاشم کی ماں بن کر پرورش کروں.... تو اماں اب میرے لیے آفتاب سے شادی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں.... یہی میری باجی کی خواہش تھی... اور میں اپنی باجی کی خواہش کے آگے اپنا سر خم کرتی ہوں۔" حسنہ نے لبادہ ایثار و وفا کا اوڑھ کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ نکلا کہ تم آفتاب سے شادی کرنے پر تیار ہو۔"

"ہاں اماں۔" حسنہ نے زیرِ لبی مسکرا کر جواب دیا۔

بیٹی کا بصیرت آمیز جواب سنتے ہی ماں کے انگ انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ خوشیوں سے سرشار ہو کر تیز تیز ڈگ بھرتے آفتاب کے کمرے میں پہنچ گئی اور مسرت انگیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"آفتاب بیٹا' مبارک ہو۔ حسنہ اپنی بہن کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہے اور صرف تیار نہیں بلکہ تم سے شادی کرنے میں خوش بھی ہے۔"

"سچ خالہ جان!"

"ہاں بیٹا۔" خالہ نے مسرت سے اس کی جبیں پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ دوسرے دن اس نے جھٹ شادی کے کارڈ تیار کرائے اور تمام اعزا و اقارب کو بھیج دیئے۔ ایک خوبصورت کارڈ اس نے قمر کو لندن بھی بھیج دیا کیونکہ اس کے ضمیر نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ اپنی شادی پر اپنے بھائی کو نہ بلائے۔ بھائی پھر بھائی ہوتا ہے۔ چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔

○☆○

ادھر مانچسٹر برطانیہ میں قمر نے ایک روز غزالہ کا دل کرچی کرچی کیا تو دوسرے دن قمر نے میری سے خوش کن لہجے میں فون پر کہا "ہیلو ڈارلنگ' ہاؤ آر یو؟"

"آئی ایم آل رائٹ۔" میری نے قدرے بے دلی سے جواب دیا۔

"میری آج تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ نویدِ مسرت۔ وہ یہ کہ کل میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اب خوش ہو نا؟"

"خوش.....ہاں.....ہاں میں خوش ہوں۔" میری نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

"میری' تمہاری آواز میں ٹھہراؤ کیوں ہے.....بیمار تو نہیں ہو؟" قمر نے پوچھا۔

"نہیں جانِ من' میں بیمار نہیں ہوں۔"

"تو کل مجھے ریسیو کرنے ایئرپورٹ آجانا۔"

"او کے۔" پھر میری نے فون رکھ دیا۔

قمر انجانے وسوسوں میں گرفتار ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میری نے اس کے جواب کا انتظار اور بائی بائی کہے بغیر سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

دوسرے دن قمر کے جہاز نے نیویارک کے کنیڈی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ وہ خوشی خوشی ارائیول لاؤنج میں داخل ہوا اور امیگریشن کی کارروائی مکمل کرانے کے بعد باہر نکلا تو وہ رنجیدہ ہو گیا۔ کیونکہ میری اسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ لٹا لٹا ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور یہ سوچ کر میری کا انتظار کرنے لگا کہ ہو سکتا ہے میری کی کار خراب ہو گئی ہو.....یا کسی اور وجہ کی بنا پر لیٹ ہو گئی ہو۔

گھنٹہ..... دو گھنٹے... پھر تین گھنٹے انتظار کرتے کرتے گزر گئے لیکن میری نہ آئی تو قمر کے ذہن میں مخدوش خیالات جنم لینے لگے۔ وہ انجانے مخمصوں میں گرفتار ہو کر اٹھا۔ ٹیکسی ہائر کی اور میری کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھی تو ایک اجنبی عورت نے دروازہ

کھولا۔ ایک غیر جانی پہچانی عورت کو دروازے کے سامنے کھڑا دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے حلق میں کانٹا چبھتا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے انگلش میں بول پایا۔

"میڈم کیا میں غلط بنگلے پر آ گیا ہوں۔ کیا یہ میری کا گھر نہیں ہے۔ از دس میریز ہاؤس؟"

وہ عورت قمر کو رنجیدہ دیکھ کر دھیمی مسکراہٹ میں بولی "جنٹلمین' ڈونٹ وری.... دس از میریز ہاؤس.... یہ میری کا گھر ہی ہے۔ آپ صحیح جگہ پر آئے ہیں۔"

"آئی ایم ہر میڈ سرونٹ۔ میں اس کی ملازمہ ہوں..... لوسی۔"

"میں میری کا خاوند ہوں۔"

"آئی نو یو..... پلیز کم اِن..... میں تمہیں جانتی ہوں.... میری اکثر آپ کا ذکر کرتی رہتی ہے.... آیئے.... اندر آیئے پلیز۔" لوسی نے مسکرا کر کہا۔

قمر مغموم سا ہو کر اندر داخل ہوا اور صوفے پر بیٹھتے ہی لوسی سے ہم کلام ہوا "میری کہاں گئی ہے؟"

"وہ نائٹ کلب گئی ہے۔" لوسی نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو اسے اپنے آنے کی اطلاع کل ہی دے دی تھی.... پھر وہ کلب کیوں چلی گئی۔" قمر نے پوچھا۔

"اچانک اس کا بوائے فرینڈ جوزف آ گیا۔ وہ ضد کر کے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" لوسی نے اپنی مالکہ کی صفائی پیش کی۔

لوسی کا جواب سن کر قمر کا دل پژمردہ ہو گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے دل مسوس کر پوچھا۔ "وہ کون سے نائٹ کلب گئی ہے؟"

"کنگ نائٹ کلب۔" لوسی نے جواب دیا۔

"او کے لوسی... میں زیادہ دیر میری کا انتظار نہیں کر سکتا... میں ابھی نائٹ کلب جاتا ہوں اور اسے گھر لے آتا ہوں۔" قمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

قمر نائٹ کلب پہنچا تو موسیقی کی تیز دھنوں پر اختتامی رقص ہو رہا تھا۔ میری ایک وجیہہ وتنومند گورے کے ساتھ محوِ رقص تھی۔ قمر نے اسے غیر مرد کے ساتھ رقص کرتے دیکھا تو

اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ اچانک موسیقی کی دھنیں بند ہوگئیں اور میری اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک کمرے میں گھس گئی۔ قمر نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ اندر سے بند تھا..... پھر قمر کا دماغ چکر کھانے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کہ ایک بھاری جسم والے مرد نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور انگریزی میں بولا "او اسٹوپڈ مین۔ انتہائی رازداری کے کمرے کے سامنے تم کیوں کھڑے ہو۔"

قمر نے طیش میں آکر کہا "تم کون ہو پوچھنے والے۔ میں تو اپنی بیوی کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔"

"او بلیک مین میری اور تمہارا کیا جوڑ... تم نے شراب تو نہیں پی رکھی..... کہ میری کو اپنی بیوی بتاتے ہو۔" موٹے آدمی نے قمر کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

قمر نے پلک جھپکنے میں اپنا پنجابی پنجہ آزمایا۔ بیچارہ موٹا ایک ہی مکے سے چاروں شانے چت گر پڑا۔ پھر قمر نے زور سے بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری جو صرف بلاؤز پہنے ہوئے تھی' دروازہ کھولتے ہی گرج کر بولی۔ "دیکھوں تو سہی کون ایڈیٹ دروازہ بجا رہا ہے۔"

جونہی میری کی نظر قمر پر پڑی تو اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ ندامت سے پانی پانی ہو کر گویا ہوئی۔

"قمر آئی ایم ویری سوری۔" پھر وہ تیزی سے پلٹی اور پھرتی سے جینز پہن کر آگئی۔ درآں اثنا اس کا محبوب جوزف بھی وقت کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھ گیا۔ قمر نے گورے کو بھی پینٹ پہنتے دیکھ لیا۔ گورا بھی پینٹ پہن کر دروازے کے پاس پہنچ گیا اور میری سے ہمکلام ہوا۔ "میری کیا بات ہے..... یہ سفلہ تم سے کیا چاہتا ہے۔"

"جوزف' یہ میرا خاوند قمر ہے۔"

"آئی سی ہی از اسٹوپڈ۔ تمہارا خاوند نرا بدھو ہے۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم دونوں کیا کر رہے......"

جوزف اپنی بات مکمل نہ کر سکا کیونکہ ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر لگ چکا تھا۔

جوزف نے بھی تڑاخ سے قمر کو تھپڑ مارا۔ درآں اثنا بھاری بھرکم آدمی جو کہ نائٹ کلب کا مالک تھا' وہ کلب کے چند ملازمین کے جلو میں وہاں پہنچ گیا اور قمر کی خوب درگت بنائی۔

میری قمر کو پٹتے دیکھتی رہی۔ پھر پولیس بھی وہاں پہنچ گئی کیونکہ کلب کے مالک نے کلب میں امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کی رپورٹ فون پر کردی تھی۔ پولیس قمر کو پکڑ کر لے گئی۔ لیکن میری نے اپنے شوہر کی صفائی میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ بلکہ وہ اس کے سامنے ہی جوزف کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر کمرے کے اندر چلی گئی اور قمر جتنے دن حوالات میں بند رہا وہ اس سے ملنے بھی نہ گئی۔

ہفتے بعد پولیس نے یہ کہہ کر قمر کو چھوڑ دیا "ہیلو ایشین... پکڑو طلاق کے کاغذات.... میری نے تمہیں ڈائی وورس کر دیا ہے۔ ہم میری کی ضمانت پر تمہیں چھوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ آئندہ بھولے سے بھی میری کے گھر کا رخ نہ کرنا..... ورنہ زندگی بھر جیل کی ہوا کھاتے رہوگے.... ہاں اگر تم جوزف اور میری کی شادی میں شرکت کرنا چاہو تو یہ لو دعوت نامہ جو میری دے گئی ہے۔"

پولیس انسپکٹر کی زہریلی گفتگو سن کر قمر کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ وہ ہارے ہوئے قمار باز کی مانند خالی دامن لیے سیدھا ائرپورٹ پہنچا اور ملنے والی پہلی فلائٹ سے برطانیہ پہنچ گیا۔

قمر جب گھر پہنچا تو جاوید اور غزالہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ انہوں نے اس کی قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبالیں۔ قبل اس کے کہ وہ اس کی حالتِ غیر کی وجہ پوچھتے' قمر خود ہی روہانسا ہو کر گویا ہوا "جاوید' میری نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ دھوکا..... وہ دغا باز ہے۔"

پھر وہ دھاڑیں مار مار کر روتا بھی رہا اور اپنی دلخراش داستان بھی سناتا رہا۔ جاوید اور غزالہ مسلسل اسے دلاسا دیتے رہے۔

دوسرے دن غزالہ نے قمر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ باب وا ہوا تو غزالہ نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا "یہ لیں لیٹر.... یہ لیٹر پاکستان سے آیا ہے.... مراسلہ نگار کوئی آفتاب صاحب ہیں۔"

آفتاب' اپنے بڑے بھائی کا نام سن کر قمر کا دل کھل اٹھا۔ اس نے جلدی جلدی خط کھولا اور انہماک سے پڑھنے لگا۔ "قمر، تم نے حسینہ پر بہت ظلم کیا... تم نے پیکرِ وفا بیوی کو بغیر کسی قصور و گناہ کے طلاق دے دی۔ میں نے بہت کوشش کی حسینہ کے غموں کو بانٹ سکوں لیکن میری قربانی رائیگاں گئی۔ میں اس سے شادی کر کے بھی اس کے دل کو مہکا و گرما نہ سکا۔ اس لیے کہ اس کے دل میں ہمیشہ تمہاری محبت کا چراغ فروزاں رہا..... میری سعیِ پیہم اور عقیدتِ صمیم تمہاری چاہت کے شعلے کو بجھانا تو کجا ماند بھی نہ کر سکی۔ اب وہ بے وفا دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکی ہے....."

بڑے بھائی کا دل کو مرتعش کرنے والا خط پڑھتے پڑھتے قمر کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس کے مرتعش ہونٹوں سے صرف مختصر سا جملہ ادا ہو سکا۔ "آہ حسینہ۔"

پھر وہ مضمحل و ساکت ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ غزالہ اس کے پاس بیٹھ کر اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

"قمر صبر کرو۔ صبر۔"

غزالہ کے دلاسا دینے پر اس نے ہمت کر کے خط آگے سے پڑھنا شروع کیا۔ "میں حسینہ کے مرتے وقت کی آرزو کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں اس کی چھوٹی بہن حسنہ سے شادی کر رہا ہوں.......جو اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو طے پائی ہے۔ اگر تم شادی اٹینڈ کرنا چاہو تو یہ ہمارے لیے باعثِ مسرت ہو گا۔ فقط تمہارا بھائی آفتاب۔"

برادرِ بزرگ کا خط پڑھ کر اس کی آنکھوں کے تارے چھوٹ گئے۔ وہ خوب رویا جب کہ غزالہ افسوس کا آنچل اوڑھے اسے تسلیاں دیتی رہی۔

قمر کی زندگی میں مکافاتِ عمل کا آغاز تو اس دن سے ہی ہو چکا تھا جب الزبتھ نے اسے مکھن کے بال کی طرح اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ اب تو قمر کے آنگن میں غموں نے مستقل ڈیرا ڈال لیا۔ وہ مغموم و پراگندہ رہنے لگا۔ جاوید اور غزالہ دونوں بھائی بہن اسے سمجھاتے اور حسین دنیا کی خوبصورت ڈگر پر لانے کی کوشش کرتے رہتے۔

غزالہ کے لیے تو میدان صاف ہو گیا تھا۔ وہ ایک شکستہ انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کو

اپنی مٹھی میں لے کر اپنی زندگی کے بجھے ہوئے دیئے کو دوبارہ روشن کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا ہمہ وقت اس کے آگے آنکھیں بچھا کر رکھتی اور اپنی کافرانہ اداؤں سے اسے اپنے دامِ الفت میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔

"ارے قمر اس جادو نگری میں جادوگر نازنینوں کی کمی تو نہیں ہے کہ جو تمہارے دل کو اپنے دل کی طشتری میں سجا نہ سکے۔ ارے نادان محبوب..... اس دنیائے رعنا میں تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین ہے..... ذرا اپنے منہ سے غموں اور پریشانیوں کا خول اتار کر دیکھو تو سہی۔"

خوبرو غزالہ کے چاہت بھرے جملوں و غمزوں کی تابش سے قمر کا دل پل بھر کے لیے پگھل تو جاتا لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ جاتا۔

ایک روز غزالہ سے اس کے بھائی جاوید نے چاہت بھرے انداز سے پوچھا "میری پیاری بنّو۔ جب تم نے عامر سے شادی کی ضد کی تھی تب بھی میں تمہارے راستے کا روڑہ نہ بنا۔ باوجودیکہ میں عامر کو پسند نہیں کرتا تھا.... اس لیے کہ تم میری اکلوتی بہن ہو اور تمہاری خوشیاں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

جاوید نے اپنی گفتگو کو لگام ڈالی تو غزالہ رنجور ہو کر بولی "بھیا' چپ کیوں ہو گئے۔ اپنا مدعا زبان پر ضرور لاؤ.... نہیں تو تمہاری بہن غموں سے نڈھال ہو کر مر جائے گی۔"

بہن کو رنجیدہ پا کر جاوید نے لبوں کو کھولا "قمر عیاش و اوباش شخص ہے۔ وہ اب تک چار البیلی دوشیزاؤں کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ اگرچہ وہ میرا گہرا دوست ہے اور میری فیکٹری کا کرتا دھرتا بھی ہے۔ پھر بھی میں نہیں چاہتا کہ تم اس بھنورے کے قریب جاؤ" پھر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر گویا ہوا "کیا میری پیاری بہن اپنے بھیا کی بات مانے گی۔"

"بھیا تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر.... لیکن۔"

"لیکن کیا.... میری بنّو بولو... بولو۔"

غزالہ کٹ کر بولی "بھیا میں ہر وقت ہنستی ضرور رہتی ہوں لیکن میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ میرا دل بہت بڑا ہے کہ میں دلخراش غم سہنے کے باوجود جینا چاہتی ہوں....

جینا چاہتی ہوں۔"

پھر وہ خاموش ہو گئی۔

غزالہ کو ساکت دیکھ کر بھائی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے بولا "بہن بتاؤ.... تم کو کون سے غم نے اپنے مضبوط ہالے میں بند کر رکھا ہے۔"

غزالہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "بھیا عامر کو پا کر میں بہت خوش تھی۔ میں سمجھی تھی جیسے دنیا میں ہی مجھے جنت مل گئی ہے۔ عامر بھی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا.... شادی کے پہلے تین سال تو خوشی و ہنسی سے گزر گئے۔ بعد میں عامر کو اولاد کی فکر ہوئی.... تو پھر ہم دونوں نے اپنا چیک اپ کرایا۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ عقدہ کھلا کہ عامر مکمل طور پر فٹ تھا اور میں بچہ جننے کے قابل نہ تھی۔ مجھے خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میڈیکل رپورٹ غلط ہے۔ لہٰذا عامر نے ایک دوسرے ہسپتال سے میرا چیک اپ کرایا تو اس کی رپورٹ نے بھی میری زندگی کے کاغذ پر مہر ثبت کردی کہ میری گود کبھی ہری نہیں ہو سکتی۔"

پھر غزالہ چپ ہو گئی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ سانس کھینچ کر بولی "چند دن ہی گزر پائے ہوں گے کہ عامر نے مجھ سے کہا...... غزالہ جانی اب ہم دونوں کے لیے بہتر ہے کہ اپنے اپنے راستے جدا کرلیں۔ میں نے بڑی سوچ و بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کرلوں.... میں تمہاری کوکھ سے اولاد نہ ہونے والے راز کو ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھوں گا.... میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زندگی برباد ہو..... میری قلبی تمنا ہے کہ تم بھی دوسری شادی کرکے اپنے آنگن میں مسرتوں کا مصباح روشن رکھو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہاری کوکھ سے اولاد نہ ہونے والے راز کو ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھوں۔ کیونکہ اگر تمہارا راز افشا ہو گیا تو پھر کوئی مرد بھی تم سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ لہٰذا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ اپنی زبان بند رکھوں گا اور تمہیں طلاق دینے کا الزام بھی اپنے سر تھوپ لوں گا.... اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے.... ہمیشہ کے لیے۔" غزالہ خاموش ہو گئی۔

ہمشیرہ کی دل چیرنے والی داستان سن کر جاوید کفِ افسوس ملنے لگا۔

غزالہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "قمر اب بازی ہار چکا ہے۔ وہ میرے لیے سونے کی چڑیا ہے۔ وہ بہترین شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری کوشش ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرکے میرے گلستانِ زیست میں روٹھی ہوئی بہاریں لوٹا دے۔"

پُر عزم بہن کی پُر غم کہانی سن کر جاوید بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنی بہن کی ہمت و بصیرت پر فخر و ناز کرنے لگا۔

اس کے بعد غزالہ موقعہ بہ موقعہ قمر پر اپنی سحر طرازیوں کا جال پھینکتی رہی اور وہ اس کے جال سے بچ نکلتا رہا۔

قمر اتنا شریف بھی نہیں تھا۔ وہ تو عورت کا رسیا تھا پھر کیونکر وہ گوری رنگت اور غزالی آنکھوں والی غزالہ کے دامنِ محبت میں گرفتار ہونے سے بچتا رہتا۔ کیونکہ ان دنوں وہ میری کی بے وفائی کی وجہ سے قفسِ الم میں مقید تھا اور اسے پنجرے سے نکالنا ایک جاں کاہ کام تھا۔ لیکن غزالہ نے ہمت نہ ہاری اور اس نے اپنی آخری تدبیر عید الفطر کے دن آزمائی۔

نماز کے بعد جاوید، قمر، جاوید کی بیوی میز پر سجی مختلف النوع ڈشوں سے دل بہلا رہے تھے کہ غزالہ غرارے و قمیص میں ملبوس بن سج کر میز کے قریب پہنچی اور آداب کہہ کر قمر کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جاوید بہن کے کرسی پر براجمان ہونے کے بعد بولا "آج تو شاید غزالہ رانی نے بیوٹی پارلر سے میک اپ کرایا ہے۔ تب ہی تو بنورانی آج بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔ چشمِ بد دور...... ماشاءاللہ اس کی چمک دمک سے ڈائننگ روم بقعۂ نور بن گیا ہے۔"

غزالہ ناک بھوں چڑھا کر بولی "بھیا جانی.... میں تو پہلے ہی حور ہوں۔ ابھی میک اپ نے صرف سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ رہا میک اپ کا سوال تو وہ بھی آپ کی لاڈلی بہن نے خود کیا ہے۔"

"بہت خوب!" بھیا خوش ہو کر بولا اور اٹھ کر اس کی درخشندہ جبیں کو چوم لیا۔

کن انکھیوں سے قمر نے بھی غزالہ کو دیکھا جو اسے چودھویں کا چاند لگ رہی تھی لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد غزالہ نے بھیا سے التجا کی "بھائی جان آج میرا بیچ پر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا آپ مجھے ساحلِ سمندر پر گھمانے لے جائیں گے؟"

جاوید جو اپنی بہن کی خوشیوں کو بانٹنا چاہتا تھا اور آرزو مند تھا کہ قمر اور غزالہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں، سوچتے ہوئے بولا۔ "میں اور تمہاری بھابی تو امجد کے گھر انوائٹ ہیں۔ قمر فارغ ہے، اگر تم قمر کے ساتھ جانا پسند کرو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پھر جاوید قمر سے بولا "ٹھیک ہے نا قمو..... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"ٹھیک ہے جاوید... بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔" قمر نے قدرے خوشی سے کہا۔

پھر قمر اور غزالہ لیورپول کے ساحلِ سمندر کی طرف روانہ ہوگئے جو کہ مانچسٹر سے صرف ۳۴ میل کے فاصلے پر تھا۔ جب وہ سمندر پر پہنچے تو وہاں میلے کا سماں تھا۔ شاید عید کی خوشیوں کو گلے لگانے لیورپول کے زندہ دلوں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ ہر سو شہزادے و شہزادیاں لہروں سے کھیل اور دلوں کو بہلا رہے تھے۔

غزالہ نے ساحل سمندر پر گھروندا بنانا شروع کردیا۔ جبکہ قمر اس کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ غزالہ نے یہ پوائنٹ خاص طور پر نوٹ کیا کہ جو جل پری مختصر لباس پہنے اس کے پاس سے گزرتی وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور کچھ دیر کے لئے اپنی بے چین نظریں اس خراماں خراماں چلتی نازنین پر گاڑے رکھتا۔

غزالہ جو قمر کی کمزوری سے آگاہ ہو چکی تھی، بذاتِ خود جوان اور خوبصورت تھی۔ کشادہ سینہ، پتلی کمریا اور سڈول جسم کی حامل..... اسے اپنے کافرانہ جسم کے اتار چڑھاؤ پر ناز تھا۔ لیکن وہ مغربی لڑکیوں کی مانند اپنے جسم کی نمائش نہیں کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیص پہنتی تھی۔ کبھی کبھار ساری بھی پہن لیتی۔ لیکن اپنی اسکیم کی کامیابی کے لئے اسے زندگی میں پہلی دفعہ اپنے سحرانگیز تن سے پہناوے کو اتارنا پڑا۔ اس نے مخمور آنکھوں سے قمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ جانِ من، ذرا بپھری ہوئی لہروں کے ساتھ ہم بھی لہرالیں۔"

"غزالہ، آج میرا نہانے کا موڈ نہیں ہے۔" قمر نے ذرا بے دلی سے کہا۔

غزالہ جس نے اپنے منصوبے کے مطابق پہلے ہی غرارے قمیص کے نیچے نہانے کا مختصر لباس زیب تن کر رکھا تھا، چشم زدن میں غرارے قمیص کو اتارا اور تیکھے انداز و خراماں چال سے پانی کی طرف چل پڑی۔ اس کی کافرانہ ادا اور مرمریں جسم کے جوار بھاٹے کو دیکھ کر قمر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ آنکھوں کو ملنے لگا۔

در آں اثنا غزالہ اپنے قاتل جسم کو جھٹکا دے کر واپس مڑی اور پیار بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

"قمر آؤ نا..... پلیز مل کر نہائیں۔"

قمر جو مکمل طور پر غزالہ کے حسن کے شیشے میں اتر چکا تھا، بے چون وچرا ریت سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر چل پڑا، پھر وہ اور غزالہ..... غزالہ اور وہ دیر گئے تک لہروں سے کھیلتے رہے۔ انہیں وقت گزرنے کا بھی پتا نہ چلا۔

جب چہار سو ملگجا اندھیرا پھیل گیا تو غزالہ نے مدھ بھری مسکراہٹ سے کہا "قمر چلو گھر چلیں۔"

"جانی کیا ہم رات یہیں نہیں بسر کرسکتے۔" قمر نے نیم مدہوشی میں کہا۔

"ارے جانی..... جب گھر کی چار دیواری ہمارا انتظار کر رہی ہیں تو بھلا یہاں سونے کا کیا فائدہ۔" غزالہ نے ہنس کر کہا۔

"چار دیواری سے تمہارا کیا مطلب ہے" قمر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"قمر جانی ہمیں چار دیواری میں سچی خوشی ملے گی۔ ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر در و دیوار کو اپنے چاہت کے گیت سنائیں گے۔" غزالہ نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"سچ غزالہ۔"

"ہاں قمر"

"کیا جاوید بھیا ہم دونوں..... ہم دونوں کی شادی کی تجویز کو منظور کرلیں گے۔ جبکہ میں ان کی نظروں میں ایک اچھا آدمی نہیں ہوں۔" قمر نے افسردگی سے کہا۔

"ارے قمر جانی، اب ہماری حرکات و سکنات زیرِ عتاب نہیں آسکتیں۔ اس لئے کہ میں

تم سے والہانہ پیار کرتی ہوں اور بھائی جان بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بھائی جان کو منانا میرا کام ہے۔" غزالہ نے سحر انگیز آنکھوں سے قمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

قمر نے وارفتگی سے غزالہ کو سینے سے بھینچ لیا۔

جب غزالہ کی اسپورٹس کار گھر پہنچی اور وہ دونوں ہنستے ہنستے کار سے نکل کر گھر کی طرف بڑھے تو جاوید اور اس کی بیوی جو اُن کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے' انہیں خراماں خراماں آتے دیکھ کر مسرور ہو گئے۔ ان کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا لیکن جونہی اطلاعی گھنٹی بجی' وہ اپنے اپنے کمرے میں گھس کر محوِ شغل ہو گئے جیسے انہیں غزالہ و قمر کے آنے کا علم ہی نہ تھا۔

بعد میں جاوید کے گھر چہار سو خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ خوشیوں کے شادیانے بج اٹھے۔ گھر کے چمنستان میں بہار آگئی اور جیتے جاگتے پھول مسکرا و مہک اٹھے۔

گھر کی اندرونی و بیرونی دیواروں کو رنگ برنگ کاغذی پھولوں کی لڑیوں اور برقی قمقموں سے سجادیا گیا۔ جاوید کا گھر بقعۂ نور و عطر بن گیا۔ پھر ایسے پُر بہار موسم میں غزالہ و قمر کو مسندِ عقیدت پر بٹھادیا گیا تاکہ وہ زندگی بھر چاہت کا جھولا جھلاتے رہیں۔

یہ ربِ ذوالجلال کی رحمت تھی یا قسمت کا تماشا کہ دونوں بھائی ایک ہی روز رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ قمر کی مانچسٹر میں غزالہ سے اور آفتاب کی کراچی میں حسنہ سے شادی ہوئی۔ دونوں بھائیوں نے خوب خوشیوں کے چراغ روشن کئے اور ان کی مدھم کرنوں سے اپنے اذہان و قلوب کو منور کیا۔

پھر وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ ماہ و سال نے کئی لبادے اوڑھے اور اتارے۔ قمر کے آنگن میں تو پھول نے کھلنا ہی نہیں تھا۔ لیکن بن پھول کے بھی اس کا آنگن آباد تھا۔ وہ اور غزالہ پُر بہار زندگی گزار رہے تھے۔

بالکل اسی طرح ڈاکٹر حسنہ اور کسٹم آفیسر آفتاب بھی خوش و خرم زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہاشم کے علاوہ ان کے چمنِ حیات میں قاسم اور زویا جیسے خوبصورت پھول بھی کھلے تھے جن کی مہک سے ان کے دل بھی مہکے و کھِلے ہوئے تھے۔

ہاشم بی ایس سی' قاسم میٹرک اور زویا آٹھویں جماعت میں پہنچ گئے۔ تینوں بچے بڑے ہی ذہین و نیک تھے۔ وہ اپنے والدین کی آنکھوں کا نور اور اپنے اساتذہ کرام کے منظورِ نظر تھے۔ ہاشم ایم بی اے کرنا چاہتا تھا۔ قاسم انجینئر اور زویا ماں کی طرح ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔

پھر تینوں بہن بھائیوں کے نتائج نکلے تو تینوں اے گریڈ میں پاس ہوئے۔ آفتاب اور حسنہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ انہوں نے ان کے پاس ہونے کی خوشی میں شاندار پارٹی ارینج کی اور ممتاز شخصیات کو مدعو کیا۔

لیکن ان کی خوشیاں وقتی ثابت ہوئیں۔ اس لئے کہ ہاشم کو لاہور یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملا۔ وہ داخلے سے صرف دو نمبروں سے محروم رہا۔ میرٹ پر داخلہ ملنے والے آخری امیدوار کے نمبر ۸۷۰ تھے جبکہ ہاشم کے نمبر ۸۶۸ تھے۔ ہاشم بہت ہی افسردہ رہنے لگا تو آفتاب اور حسنہ دونوں کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ اس کو بہت تشفی دیتے لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ بہن بھائی اس کو سمجھاتے "بھیا جی چھوڑو ایم بی اے کو.... ایم بی اے میں کیا رکھا ہے۔ ڈاکٹر بن جاؤ۔ پچھلی دفعہ ڈاکٹری میں میرٹ صرف ۸۰۸ نمبر تھا۔ ایم بی اے میں کمپیٹیشن بہت ہے کیونکہ ایم بی اے کی کلاسز پنجاب بھر میں فقط لاہور اور قائدِ اعظم یونیورسٹی میں ہوتی ہیں جبکہ ڈاکٹری کے لئے سات کالجز ہیں۔"

ہاشم پر ان کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوتا اور وہ منہ لٹکا کر اٹھ جاتا۔

ایک روز آفتاب کی نظر ایک امید افزا اشتہار پر پڑی۔ "کوئین کالج لندن میں داخلہ" اشتہار پڑھنے کے بعد آفتاب کا دل خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ قاسم داخلے کی مطلوبہ شرائط پر پورا اترتا تھا۔ آفتاب نے اسی وقت گھر فون کیا۔ ریسیور ہاشم نے ہی اٹھایا۔

"ہیلو.... ہاشم اسپیکنگ۔"

"ہاشم بیٹا تمہارے لئے خوش خبری۔"

"کون سی خبر ابو؟"

"بیٹا تم لندن جانے کی تیاری کرو۔ کوئین کالج لندن میں تمہارا داخلہ ہونا یقینی ہے۔"

"سچ ابو!"

"ہاں بیٹا یہ سچ ہے۔"

ہاشم امید افزا خبر سن کر پاپ گیتوں کی کیسٹ لگا کر خوشی سے رقص کرنے لگا۔ وہ ابو کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کب ابو آئیں گے اور تفصیل کے ساتھ داخلے کی بات بتائیں گے۔

لیکن ابو سے پہلے قاسم اور زویا آئے۔ وہ ہاشم کے کمرے سے انگلش گانے کی آواز سن کر حیران ہو گئے۔ وہ متحیر اس لئے ہوئے کہ کافی عرصے کے بعد انہوں نے بڑے بھائی کو گانے سنتے دیکھا تھا۔ وہ خوش تھے کہ آج ان کا بھائی خوش ہے۔ وہ خوشی خوشی کمرے میں داخل ہوئے تو ہاشم نے انہیں دیکھ کر نعرہ لگایا "اوہو' اوہو' اوہو۔"

پھر ہاشم نے خوش ہو کر زویا کو اٹھا لیا۔

زویا خوش ہو کر بولی "بھیا جی' کچھ بتاؤ تو سہی کیا بات ہے۔ آج بھیا اتنے خوش کیوں ہیں۔"

"ارے کم بختو.... میں لندن جا رہا ہوں.... لندن۔ ایم بی اے کی ڈگری لینے۔"

قاسم اور زویا خوشی سے چیختے یک زبان ہو کر بولے "سچ بھیا!"

"ہاں' ہاں۔"

پھر تینوں خوش ہو کر لڈی ڈالنے لگے۔

دبے دبے قدموں کے ساتھ حسنہ بھی پہنچ گئی۔ جب تینوں نے ماں کو دیکھا تو یکدم سہم گئے اور صوفے پر دبک کر بیٹھ گئے۔

حسنہ نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے پوچھا "ارے بچو! آج تم تینوں بہت خوش ہو۔ کیا مجھے اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کرو گے۔"

اسی اثنا میں آفتاب بھی گھر پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہوئے لڈو حسنہ کے منہ میں ڈالا اور مسرور لہجے میں بولا "حسنہ جی..... ان کی خوشیوں کی بات سے میں پردہ اٹھاتا ہوں۔ ہاشم لندن جا رہا ہے 'لندن' پڑھنے کے لئے۔"

حسنہ نے یہ فرحت آمیز خبر سنتے ہی ہاشم کو گلے لگا لیا۔ "خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے بچے کی مراد پوری ہو گئی ہے۔ میں واری جاؤں۔"

حسنہ والہانہ انداز سے ہاشم کی بلائیں لینے لگی۔

ہاشم کا پاسپورٹ بنوایا گیا۔ ویزے کی ضروری کارروائی مکمل کی گئی اور تقریباً ایک ماہ بعد ہاشم لندن روانہ ہو گیا۔ زویا' قاسم' حسنہ اور آفتاب نے اشکبار آنکھوں سے اپنے چاند کو الوداع کیا اور باقاعدگی سے خط لکھنے کی ہدایت کی۔

دوسرے دن اس نے ای پی سی کا ٹسٹ دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔ اسی شام کوئین کالج ہوسٹل میں اسے کمرہ الاٹ کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس کا روم میٹ سیالکوٹ کا رہنے والا مہتاب تھا۔

وہ واقعی سیالکوٹ کا مہتاب تھا۔ اس کی باتوں میں بھی ٹھنڈی کرنیں شامل تھیں۔ جس سے ماہتاب اور آفتاب دونوں کو ٹھنڈک و خوشی مل رہی تھی۔ وہ والدین' بہن بھائیوں سے جدائی کا غم بھی میٹھی میٹھی باتوں سے بانٹ رہے تھے۔

ایک بات کا غم و دکھ ہاشم و مہتاب دونوں کو تھا۔ وہ دکھ یہ تھا کہ ان دونوں کی گریجویشن کی ڈگری ایکسیپٹ (ACCEPT) نہیں کی گئی تھی۔ وہ ایچ ایس سی پاس اسٹوڈنٹ سمجھے گئے تھے۔ یہ حادثہ صرف ان کے ساتھ ہی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ترقی پذیر ملک کے ہر ایک ایکسٹرنل اسٹوڈنٹ سے یہی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔

شروع شروع میں ہاشم بہت پریشان ہوا۔ ماحول الگ تھا' بھرا پیارے ابو' امی' بہن بھائی کی جدائی کا غم کھائے جا رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے ماحول میں اڈجسٹ ہو گیا۔ دوسرے مہتاب بھی اس کے لئے ایک نایاب ہیرا ثابت ہوا۔ وہ اس کے لئے بھائی بھی تھا اور دوست بھی۔

کلاس کی ایک لڑکی نہایت خوبصورت و چنچل تھی۔ بوٹا سا قد' سرخ و سپید رنگت' سڈول جسم' جھیل نما سیاہ آنکھیں' کتھئی چمکدار بال اور پُروقار چہرہ۔ وہ لیاقت و ذہانت میں کلاس کی ٹاپ موسٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ..... وہ قاتل حسینہ ہاشم کے ذہن سے اتر کر اس کے

دل میں سما گئی۔

وہ اس سے والہانہ پیار کرنے لگا لیکن کبھی اس میں جرات نہ ہوئی کہ وہ اس سے اپنے پیار کا ذکر کرتا۔ شاید یہ اس کی شخصیت کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی کہ ہاشم اپنے دل کی بات اس سے نہ کہہ سکا۔

اس شوخ لڑکی کا نام ڈیانا تھا۔ اس پر یورپین ماحول کا رتّی بھر اثر نہیں تھا۔ وہ میک اپ بھی نہیں کرتی تھی' اسکرٹ بھی لمبا پہنتی اور کلاس میں فضول باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی کلاس میں عجوبہ کے نام سے پہچانی جاتی۔ وہ اگر کسی لڑکے سے فری تھی تو وہ الیگزینڈر تھا جو اسی کی طرح فطین اسٹوڈنٹ تھا۔ لہٰذا کبھی کبھار ڈیانا اس سے ضروری نوٹ لے لیتی اور وہ دونوں پڑھائی کے معاملے میں صلاح مشورہ بھی کرتے رہتے۔ پھر وہ دونوں کلاس میں اکٹھے بیٹھنے لگے۔ لیکن وہ دونوں کوئی نازیبا حرکت ہرگز نہیں کرتے تھے۔ ان کا پیار خاموش تھا اور اس میں شرافت جھلکتی تھی۔

ایک روز ہاشم باتوں ہی باتوں میں مہتاب سے بولا "مہتاب بھائی' مجھے ڈیانا بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے اُس سے بہت پیار ہے لیکن میں اس سے پیار کا اظہار نہیں کر سکتا' مجھے اس کی پُروقار شخصیت کو دیکھ کر ہمت ہی نہیں پڑتی کہ میں اس سے ایسی ویسی بات کر سکوں۔"

مہتاب قدرے جھنجلاہٹ سے بولا "یار' لائٹ آف کرو۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ اور ڈیانا کا خیال تم دل سے نکال دو' وہ نہایت شریف لڑکی ہے۔ سمجھے۔"

"ہاں سمجھ گیا۔" ہاشم بے دلی سے بولا اور سوئچ آف کر دیا۔

ایک روز ہاشم کی پوری کلاس پکنک منانے سمندر پر گئی۔ تمام لڑکے لڑکیاں سوئمنگ کاسٹیوم لباس زیب تن کئے سمندر میں نہا رہے تھے لیکن ڈیانا اسکرٹ میں ہی ملبوس گھروندے بنا رہی تھی جبکہ الیگزینڈر اس کے پاس ریت پر لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد' ڈیانا اٹھی اور دوڑتی ہوئی پانی کی طرف بھاگی۔ پھر لہریں اسے گہرے پانی کی طرف لے گئیں۔ شائد الیگزینڈر اور ڈیانا دونوں تیرنا نہیں جانتے تھے۔ ڈیانا نے شور مچانا شروع کر دیا۔ "بچاؤ' بچاؤ۔"

ڈیانا کی آواز سن کر ہاشم کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر اس نے الیگزینڈر کی آواز سنی۔

"ڈیانا ڈوب رہی ہے..... پلیز اسے بچاؤ....."

لیکن ہر ایک اپنے اپنے کھیل میں مست تھا۔ کوئی بھی ڈیانا کی چیخیں اور الیگزینڈر کی پکار نہیں سن رہا تھا ماسوائے ہاشم کے۔

ہاشم نے فوراً پانی چھلانگ لگا دی اور گہرے پانی کی طرف تیرنا شروع کر دیا پھر وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑی مشکل سے اسے کنارے تک لایا۔

کنارے پر اس نے اسے اوندھے منہ لٹایا اور اس کے پیٹ سے پانی نکالا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے دھیمی آواز میں کہا "ہاشم' تھینک یو ویری مچ۔"

"یہ تو میرا فرض تھا۔" ہاشم خندہ زیرلبی سے گویا ہوا۔

"ڈیانا کی زندگی بچانے پر ہاشم تمہارا بہت بہت شکریہ۔" الیگزینڈر نے کہا۔

الیگزینڈر کی آواز سن کر ہاشم کو غصہ تو آیا لیکن وہ پی گیا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہوتا ہے شکریہ کہنے والا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈیانا کی برتھ ڈے پارٹی تھی چونکہ ہاشم نے اس کی جان بچائی تھی اس لئے ڈیانا نے الیگزینڈر کے ساتھ ہاشم کو بھی مدعو کیا۔ ہاشم بہت خوبصورت سوٹ پہن کر پارٹی میں گیا۔ ڈیانا نے اپنی ماں الزبتھ اور ڈیڈی سے یہ کہتے ہوئے ہاشم کی ملاقات کرائی۔

"ممی' اگر اس دن ہاشم نہ ہوتا تو میں ڈوب کر مر جاتی۔"

الزبتھ اور جوزف دونوں میاں بیوی نے پیار سے ہاشم کو گلے لگایا اور مسکرا کر بولے۔

"تھینک یو ویری مچ ہاشم۔"

چند ثانئے کے بعد الیگزینڈر بھی پہنچ گیا۔ ڈیانا' اس کی امی اور ابو تینوں نے مل کر والہانہ انداز سے اس کا استقبال کیا اور اسے صوفے پر لا کر بٹھایا۔

ہاشم کا دل الیگزینڈر کے شاندار استقبال کو دیکھ کر جل گیا۔ پھر جب ڈیانا اور الیگزینڈر نے مل کر برتھ ڈے کیک کاٹا تو وہ بھسم ہو گیا.... وہ زیادہ دیر انتظار نہ کر سکا اور چپکے سے واپس آ گیا۔

جب سے ہاشم نے ڈیانا کو بچایا تھا وہ ڈیانا کو اچھا لگنے لگا تھا لیکن اس چاہت میں عاشقانہ انداز نہ تھا۔ وہ اس سے بڑی محبت اور پُرخلوص لہجے میں بات کرتی تھی۔ جس سے ہاشم کو غلط فہمی ہوگئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔

ہاشم پُرامید ہوگیا تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ الیگزینڈر کو ٹھکرا دے گی۔ اس کے باوجود وہ جب کبھی ڈیانا سے بات کرتا اور محبت کا اظہار کرنا چاہتا تو اس کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ بھیگی بلّی بن جاتا۔ اس کے منہ سے ناشائستہ بات ہی نہ نکلتی۔ وہ تمیز اور سلیقے سے اس سے بات کرتا اور پھر بائی بائی کہہ کر اپنا راستہ لیتا۔

ہاشم کا پہلا سمسٹر ختم ہونے کو تھا۔ ایسٹر ہالیڈیز ہونے والی تھیں۔ ایک روز اس نے گھر فون کیا تو فون اس کی امی نے اٹھایا۔

"ہیلو امی۔"

"یس ہاشم، کیسے ہو بیٹا؟"

"امی میں بالکل ٹھیک ہوں امی! ابو، قاسم اور زویا کہاں ہیں؟"

"بیٹا! ابو تو ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آئے ہیں۔ قاسم اور زویا بس آنے والے ہی ہیں۔ آج کل اسکول سے چھٹی دیر سے ہوتی ہے۔"

"امی ایک بات....."

"ہاں ہاں.... بیٹا بولو نا.... پلیز۔"

"امی ایسٹر ہالیڈیز میں کیا مَیں پاکستان آسکتا ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی یاد بہت ستا رہی ہے۔"

"بیٹا جانی! اس میں پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ ہمارا بیٹا جانی آئے گا تو ہمارے چمن میں بہار آجائے گی۔"

"تو پھر امی..... پرسوں میں پاکستان پہنچ رہا ہوں۔"

"او کے سویٹ بیٹا۔" حسنہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

حسنہ کا دل خوشی سے مچل رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بریانی اور کسٹرڈ تیار کیا اور میز کو

کھانے کی ڈشوں سے سجا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد قاسم اور زویا آئے اور دونوں اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلے گئے۔ چند ثانئے کے بعد آفتاب بھی آگیا تو حسنہ والہانہ انداز سے اس سے ملی۔ آفتاب متحیر ہو کر بولا۔ "بیگم جانی، آج کیا بات ہے آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔"

"یہ بات میں آپ کو کھانے کی میز پر بتاؤں گی۔ چلئے آج کپڑے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا پیٹ خوشی سے پھٹ رہا ہے۔ چلئے نا۔"

آفتاب میز پر بیٹھ گیا تو حسنہ نے زور سے کہا "قاسم، زویا پلیز جلدی آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پھر پیٹ میں چوہے بھی دوڑ رہے ہیں۔"

قاسم اور زویا نے بیک وقت کہا "آرہے ہیں امی.... ہاتھ دھونے کے بعد۔"

پھر قاسم اور زویا بھی کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے جب بریانی اور کسٹرڈ دیکھا تو یک آواز ہو کر بولے "امی نے بریانی پکائی ہے۔ ضرور کوئی خوشی کی بات ہے۔"

"خوش خبری۔" حسنہ ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولی۔

"اماں پھر بتاؤ نا۔" زویا نے چہکتے ہوئے کہا۔

"حسنہ بتاؤ بھی۔" آفتاب نے لقمہ دیا۔

"اچھا تو پھر سنو..... پرسوں..... پرسوں..... جمعہ کو..... جناب ہاشم بیٹا تشریف لا رہے ہیں۔" حسنہ نے رک رک کر کہا۔

"سچ امی۔" قاسم اچھل کر بولا۔

"ہاں بیٹا یہ سچ ہے۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہاشم کا فون آیا تھا۔ ایسٹر کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اس نے مجھ سے آنے کی اجازت مانگی تھی اور میں نے اجازت دے دی۔"

"او ممی، یو آر گریٹ۔" زویا ماں کو گلے لگا کر بولی۔

"واقعی حسنہ گریٹ ہے.... دی گریٹ۔" آفتاب نے مسرور کن لہجے میں کہا۔

پھر گھر کے سب افراد خوشی خوشی بریانی کھانے لگے۔

جمعرات کی رات آئی۔ رات کو سب نے مل کر ٹی وی پروگرام دیکھا۔ نیند تو آنہیں رہی

تھی للذا پروگرام بنا کہ کوئی ٹی وی سیریل یا فلم دیکھی جائے جب رات کے دو بج گئے تو آفتاب نے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا" کیوں نہ اب تھوڑی دیر کے لئے سستا لیا جائے۔"

"آج ہاشم بھائی کے آنے کی خوشی میں نیند تو آنہیں رہی ہے۔" زویا بولی۔

"ہاں زویا کے ابو' میرا بھی یہی حال ہے۔" حسنہ نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی بندی۔ تمہاری آنکھیں تو' تمہارے سفید جھوٹ کی چغلی کھا رہی ہیں۔"

آفتاب نے مذاق میں کہا۔

"ابو...... آنکھیں تو فریب دیتی ہیں اور امی کی آنکھیں تو اکثر ہمیں بھی دھوکا دیتی ہیں۔ کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ اماں جانی بستر پر لیٹی ہیں..... آنکھیں بند ہیں..... تو ہم سمجھتے ہیں وہ سو گئی ہیں۔ پھر ہم دونوں رازدارانہ باتیں کرتے ہیں تو اماں جانی سن کر محفوظ کر لیتی ہیں اور پھر موقعہ بہ موقعہ ہمیں پیار سے چھیڑتی رہتی ہیں۔" قاسم نے بتایا۔

"ہاں بھیا ٹھیک کہتے ہیں۔" زویا نے کہا۔

"چل شریر کہیں کی۔" حسنہ نے پیار سے زویا کے رخسار کی چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

چاروں کھلکھلا پڑے اور آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

حسنہ اور آفتاب دیر گئے تک ماسٹر بیڈ روم میں باتیں کرتے رہے۔ پھر باتیں کرتے کرتے نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔ قاسم اور زویا اپنے اپنے کمرے میں آڈیو کیسٹ سے ہلکے پھلکے گیت سنتے سنتے سو گئے۔

صبح ۱۰ بجے گھر کی گھنٹی بجی تو حسنہ ہڑبڑا کر اٹھی اور آفتاب کو ہلا کر گویا ہوئی "ہاشم کے ابو' جلدی سے اٹھو..... ۱۰ بج چکے ہیں۔ ہم نے تو ساڑھے آٹھ بجے ائرپورٹ جانا تھا۔ ہائے اللہ' شاید ہاشم انتظار کرنے کے بعد خود ہی پہنچ گیا ہے۔"

حسنہ نے آفتاب کو جگایا اور بھاگتے بھاگتے دروازے کی جانب گئی اور دروازہ کھولا تو واقعی وہاں ہاشم کھڑا تھا۔ اس نے والہانہ انداز سے ہاشم کو گلے لگایا پھر دونوں ہاتھوں میں ہاشم کا چہرہ لے کر اسے چومنے لگی۔ پھر وہ زور سے چلائی۔ "ہاشم کے ابو' ہاشم آگیا ہے۔"

ہاشم کے ابو تیزی سے اپنے کمرے سے باہر نکلے دریں اثنا ہاشم ان کے کمرے تک پہنچ

چکا تھا جبکہ حسنہ نے قاسم اور زویا کو جگایا۔

آفتاب نے بڑھ کر بیٹے کو گلے لگایا اور بعد میں افسردہ لہجے میں بولے "بیٹا ہم صبح ۲ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور اب تمہاری گھنٹی کی آواز پر آنکھ کھلی ہے۔ بیٹا زیادہ دیر انتظار تو نہیں کیا۔ زیادہ کوفت تو نہیں ہوئی؟"

ہاشم کے ابو ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔

"نہیں ابو۔ مجھے کچھ کوفت نہیں ہوئی۔ میں جب ائرپورٹ سے باہر نکلا اور آپ سب کو موجود نہ پایا تو میں سمجھ گیا تھا کہ آپ لوگ رات دیر تک جاگتے رہے ہوں گے اور پھر صبح آنکھ نہیں کھلی ہوگی۔ اس لئے میں نے ٹیکسی کی اور پل بھر میں آپ کے پاس پہنچ گیا۔"

دریں اثنا زویا اور قاسم بھی آنکھیں ملتے ملتے پہنچ گئے اور خوشی سے سرشار ہو کر ہاشم کے ساتھ چمٹ گئے۔ تھوڑی دیر لپٹنے کے بعد زویا نے بھیا سے الگ ہو کر کہا "بھیا جی! آئی ایم سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔" ہاشم نے زویا کے کانوں کو دباتے ہوئے کہا۔

ہر ایک کا دل خوشی خوشی ناچ رہا تھا۔ حسنہ نے جلدی سے ناشتہ تیار کیا اور خوشی خوشی سب نے ناشتا کیا۔

زویا اور قاسم کے امتحان ہو چکے تھے۔ للذا ان دونوں نے اسکول و کالج سے ہفتہ بھر کی چھٹیاں لیں اور کراچی کی خوب سیر کی۔ تینوں نے پلاننگ کی کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مری' ایبٹ آباد وغیرہ جا کر خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہوں گے۔

آخر ہاشم کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ ۱۴ اپریل کو ایسٹر کی آخری چھٹی تھی اور اسی تاریخ کو اس نے لندن جانے کی ریزرویشن کرائی تھی۔

۱۳ر اپریل کی رات کو آفتاب نے سب اہلِ خانہ کی موجودگی میں پوچھا "ہاشم تم لندن جا کر کمزور ہو گئے ہو۔ کیا کھانا نہیں کھاتے یا کوئی اور بات ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے..... کہ مجھے ہوسٹل کا کھانا اچھا نہیں لگتا اس لیے پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتا۔" ہاشم نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ کہا۔

"بیٹا تمہارے انکل قمر بھی تو وہیں لندن میں ہی رہتے ہیں۔ تو تم انکل کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہ تمہیں بیٹے کی طرح رکھیں گے۔" آفتاب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"شاید انکل قمر ہم لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے۔ انکل نے قریبی رشتہ داروں کے مرنے پر بھی پاکستان آنا گوارہ نہیں کیا تو میرے خیال میں اس صورت میں مجھے بھی ان سے دور ہی رہنا چاہئے۔" ہاشم نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

اتنے میں کال بیل بجی۔ آفتاب گھنٹی کی آواز سن کر بولا "رات گئے کون ہو سکتا ہے۔"

"ابو میں دروازہ کھول کر دیکھتی ہوں۔" زویا نے کہا۔

"ہاشم بھیا' شائلہ اپنی ماں کے ساتھ آئی ہے۔ شائلہ خود ہی کار ڈرائیو کرکے آئی ہے۔ بہت بڑی سی کار ہے۔ وہ آپ کے لندن جانے کے بعد آئی تھی ۔ اسے جب پتہ چلا کہ آپ لندن چلے گئے ہیں تو وہ کفِ افسوس ملنے لگی۔ وہ کبھی کبھی مجھے فون کرکے آپ کی خیریت پوچھ لیتی ہے۔" زویا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

"لیکن میں شائلہ سے ملنا نہیں چاہتا۔" ہاشم نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

"ارے تم جھگڑتے ہی رہو گے یا ماں بیٹی کو اندر بھی بلاؤ گے۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"جاؤ بیٹی انہیں اندر لے آؤ۔" آفتاب نے زویا سے کہا۔

اندر آتے ہی ماں بیٹی نے بڑے عاجزانہ انداز میں سلام کیا اور ایک ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ حسنہ پری شائل شائلہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو بہت داد دی کہ جس نے ایک پری طلعت لڑکی کو اپنے لئے چنا ہے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں تخیلات کے پر لگا کر اڑنے لگی۔ اس نے شائلہ کو سرخ کپڑوں میں دلہن بنے دیکھا۔ وہ انمول ہیرے کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ مچل مچل کر ملنے والوں سے کہہ رہی تھی۔ "دیکھو میری بہو کتنی خوبصورت ہے' حور ہے حور۔"

"ارے امی..... کیا شائلہ کی کوئی خاطر تواضع نہیں کرو گی؟" قاسم نے ماں کے کندھے ہلا کر کہا۔

"کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔" وہ سٹپٹا کر کچن میں گئی اور فرج سے گلاب جامن اور کولڈ ڈرنک لے آئی۔ گلاب جامن ہاشم کو بہت پسند تھے اس لئے اس نے خاص طور پر اس کے لئے تیار کیے تھے۔

شائلہ جتنی دیر بھی وہاں بیٹھی' ہاشم کی ماں سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے حسنہ کو بہت متاثر کیا۔ وہ دل میں اس کی رعنائی و زیبائی کے گن گانے لگی۔

آدھے گھنٹہ کے بعد شائلہ اور اس کی ماں آفتاب' حسنہ' قاسم اور زویا کے دلوں میں محبت کی جوت جگا کر چلے گئے۔

حسنہ ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولی "شائلہ بڑی پیاری بچی ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ میرے دل کو بھا گئی ہے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"شائلہ تو جنت کی حور ہے.... پھر ہم اس کو کیوں پسند نہیں کریں گے۔" زویا اور قاسم نے یک زبان ہو کر کہا۔

"لیکن مجھے شائلہ قطعی پسند نہیں ہے۔ اس نے کالج کے زمانے میں مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔ بیچاری ہیر کی طرح مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن میں رانجھا نہیں بنوں گا۔"

"بھیا ہمیں بے وقوف بناتا ہے..... ویسے اس سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔" زویا نے شریر لہجے میں کہا۔

"شیطان کہیں کی..... اگر کل میں لندن نہ جا رہا ہوتا تو تجھے ضرور سزا دیتا۔" ہاشم نے زیرِ لبی تبسم سے کہا۔

"ارے چھوڑو ان باتوں کو.... اب میں اس موضوع کی طرف آتا ہوں جو شائلہ بیٹی کے آنے پر ادھورا رہ گیا تھا۔ تو بیٹے میں کہہ رہا تھا کہ..... تمہارے انکل بہت اچھے ہیں۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ لندن جا کر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے پلٹ کر پاکستان کا چکر نہیں لگایا لیکن وہ دل کے خراب نہیں ہیں۔ وہ تمہیں بیٹے کی طرح رکھیں گے۔ پھر ان کے پاس جانے میں کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ تم جا کر دیکھو تو سہی..... اگر

انہوں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا تو ان کے ساتھ رہ لینا نہیں تو پھر ہوسٹل میں آجانا۔ بیٹا جی انکل بھی ڈیڈی ہی ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں باپ کا پیار دیں گے۔" آفتاب نے ہاشم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آنٹی نے اگر برا منایا تو؟" ہاشم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے بیٹا آنٹی تو ان سے بھی اچھی ہیں..... کل ہی ان کا فون آیا تھا۔ تم لوگ کلفٹن کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔" آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

درحقیقت اسی فون پر آفتاب نے قمر کو بتایا تھا کہ تمہارا بیٹا جوان ہو کر لندن میں تعلیمی مراحل طے کر رہا ہے اور وعدہ کیا تھا کہ وہ ہاشم کو سمجھائے گا کہ وہ تمہارے ساتھ رہے۔ لیکن ساتھ ہی قمر سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہاشم کو نہیں بتائے گا کہ وہ ہی اس کا باپ ہے۔

ہاشم نے آفتاب سے پکا وعدہ کر لیا کہ وہ لندن پہنچتے ہی انکل کو فون کرے گا اور اگر انکل آنٹی کے ساتھ اسے لینے آئے تو وہ ضرور ان کے ساتھ چلا جائے گا۔ لیکن اگر وہ نہ آئے تو وہ کبھی نہیں جائے گا۔

پھر دھڑکتے دلوں کے ساتھ زویا' قاسم' حسنہ اور آفتاب نے ۱۴ اپریل کو کراچی انٹرنیشنل ائرپورٹ سے ہاشم کو الوداع کہا اور اس وقت تک ائرپورٹ کو نہ چھوڑا جب تک ہاشم کے جہاز نے رن وے کو نہ چھوڑا۔

○☆○

شمائلہ اور اس کی ماں زلیخا گھر واپس آ رہے تھے کہ فلیٹ کلب کے سامنے ایک بوڑھا روڈ کراس کرتے ان کی کار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہ مفلوک الحال شخص آناً فاناً اٹھ کھڑا ہوا اور نازیبا زبان میں کہنے لگا "سالی مجھے مارنا چاہتی تھی... بے غیرت' بے حیا۔"

زلیخا کار سے نیچے اتری اور اسے ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگی جبکہ بوڑھا گالیاں ہی دیئے چلا جا رہا تھا۔ شمائلہ تیزی سے کار سے اتری اور ماں سے بولی "ماں چلو... لوگ اس کے واویلے سے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ کہیں ہم مصیبت میں ہی گرفتار نہ ہو جائیں.... چلو ماں۔ مجھے تو یہ پاگل لگتا ہے..... پاگل۔"

"بیٹی..... دیکھو اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ ایسے میں اس کو بے آسرا چھوڑنے کی میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا۔ قریب ہی تو جناح ہسپتال ہے..... میں اسے ہسپتال لے جاؤں گی۔"

پاگل شخص جو کچھ دیر پہلے گالیاں بک رہا تھا' وہ غور سے زلیخا کو دیکھنے لگا۔ اسے گھورتے ہوئے دیکھ کر شمائلہ ڈر گئی اور بولی "پلیز ماں چلو..... یہ پاگل ضرور ہمیں کسی نہ کسی مصیبت میں ڈال دے گا۔"

"نہیں شمائلہ.... نہیں۔" زلیخا نے قدرے غصے سے کہا۔ پھر وہ پاگل شخص سے ملائمت سے گویا ہوئی "آؤ..... کار میں بیٹھو' میں تمہیں ہسپتال لے چلوں۔"

پاگل شخص بغیر کسی مزاحمت کے زلیخا کے ساتھ چل پڑا اور کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

زلیخا نے اسے نرم لہجے سے کہا "پلیز لیٹ جائیے..... آپ زخمی ہیں۔"

"نہیں میڈم.... میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ لیٹنے سے آپ کی کار کی سیٹ خراب ہو جائے گی۔"

زلیخا فوراً کار سے اتری۔ اس نے اپنے آنچل کو پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی باندھی اور اس کو لٹا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی پھر کار تیزی سے ڈرائیو کر کے جناح ہسپتال آئی اور اسے ہسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا۔

دوسرے روز زلیخا اکیلے ہسپتال پہنچی۔ مریض نے جونہی زلیخا کو دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زلیخا کو دیکھتے ہی مریض کی آنکھوں سے آنسو بھادوں بھرن کی طرح برسنے لگے۔ زلیخا اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

تھوڑے توقف کے بعد ندیم بولا "زلیخا میں تمہارا مجرم ہوں..... میں نے برسہا برس سڑکوں پر دھکے کھاتے کھاتے گزارے ہیں۔ میں نے تمہیں کُوبہ کُو ڈھونڈا تاکہ تم سے معافی مانگ سکوں..... میں بہت ہی بدکار شخص ہوں۔ میں باوفا بیوی اور مادرِ عظمیٰ کا قاتل ماں کے مرنے کے بعد میں بھی نیم پاگل ہو گیا اور مجھے سروس سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ پھر میں سڑکوں کا شہزادہ بن گیا۔ فٹ پاتھوں پر سونے لگا۔ بچے مجھے پاگل سمجھ کر پتھر مارنے لگے اور میں جواب میں گالیاں بکنے لگا۔ روٹی کا بھی بندوبست ہو جاتا، کسی ہوٹل کے سامنے بیٹھ جاتا اور بچی کھچی روٹی کھا لیتا۔ آج تمہارے مل جانے سے میری مصیبتوں کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ مجھے ماں بلا رہی ہے..... میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔"

تھوڑے توقف کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "زلیخا مجھے معاف کر دینا..... معاف۔"

ندیم کا سر ڈھلک گیا۔ زلیخا جو اس کی باتیں سن کر ساون بھادوں کی طرح رو رہی تھی، اس نے جب ندیم کو ساکت و چپ دیکھا تو اس کی غم کے مارے چیخ نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گویا ہوئی "ندیم، اللہ تجھے معاف کرے۔" اور زلیخا بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آ گئی۔

○☆○

ہاشم کو رخصت کرنے کے بعد آفتاب نے اپنے دفتر سے قمر کو فون کیا۔ "قمر بھائی۔ آج رات ۱۰ بجے ہاشم کی فلائٹ لندن پہنچے گی۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم دونوں میاں بیوی ایئرپورٹ آؤ اور اپنے بھتیجے کو ریسیو کرو..... اور پھر کوشش کر کے اسے سیدھا اپنے گھر میں لے جاؤ۔ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرو اور خوشیوں سے میری پیاری بے اولاد بھابی کی مانگ سجا دو۔"

پھر وہ نصیحت آمیز لہجہ میں گویا ہوا "قمر، جب ہاشم کی ماں مری تھی تو وہ ننھا سا بچہ تھا۔ صرف پونے چار سال کا۔ وقت گزرتا گیا اور اس نے اپنی حقیقی ماں کو یکسر بھلا دیا۔ اس روشن عنصر میں حسنہ کی انمول محبت و چاہت بھی شامل تھی..... ہم نے اس کی پرورش ماں و باپ بن کر کی ہے۔ قاسم اور زویا دونوں اسے حقیقی بھائی سمجھتے ہیں اور ہمارے کراچی کے احباب بھی۔ پنجاب کے بزرگ رشتے دار ویسے بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لہٰذا کبھی بھول کر بھی اس کا باپ بننے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی غزالہ بھابی کے سامنے اس راز سے پردہ اٹھانا۔ صرف ایک بات قابلِ قبول ہے، وہ یہ کہ تم دونوں اس سے ٹوٹ کر پیار کرو اور اسے کنونس کرو..... بیٹا جانی ہماری کوئی اولاد نہیں ہے، بھتیجا ویسے بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ تم ہمارے سچ مچ بیٹے بن جاؤ اور ہمارے دل کے گھپ اندھیرے میں اجالا کر دو..... اگر وہ تم دونوں کی بات مان لے تو پھر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

بھائی کی نصیحت آمیز باتیں سن کر قمر ہنستے ہوئے بولا "پیارے بھائی! میں سر آنکھوں سے تمہاری باتیں تسلیم کرتا ہوں۔ میں آپ کے پند و نصائح پر خلوصِ دل سے عمل کروں گا۔ انشاءاللہ آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ انشاءاللہ۔"

قمر نے مغموم لہجے میں بات کو بڑھاتے ہوئے کہا "آفتاب، تم میرے بڑے بھائی ہو۔ باپ کے مرنے کے بعد تم میرے لیے باپ کا درجہ رکھتے ہو۔ ایک بیٹا اپنے پُرخلوص باپ

سے فریاد کرتا ہے کہ اس کے لیے رب العزت کی بارگاہ میں خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی جائے کہ اسے سچی خوشیاں نصیب ہوں...... بھیا دعا کرو گے نا۔ بولو بھیا.... بدنصیب بھائی کے لیے دعا کرو گے؟"

"ہاں قمر۔ میں تمہارے لیے پانچوں وقت دعا کیا کروں گا۔" آفتاب نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ بھیا۔ خدا حافظ۔" قمر نے مسرور ہو کر کہا۔

○☆○

اللہ اللہ کر کے جہاز نے لینڈ کیا۔ پون گھنٹہ کے بعد مسافر ائیرپورٹ سے باہر آنے لگے۔ قمر اور غزالہ دونوں بے تابی سے اپنے جگر پارے کو دیکھ رہے تھے۔ قمر اور آفتاب دونوں بھائیوں کی شکل ملتی جلتی تھی۔ ہاشم بھی ہو بہو قمر پر گیا تھا۔ اس لیے قمر نے دور سے اپنے لختِ جگر کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ فرطِ محبت سے آگے بڑھا اور بیٹے کو گلے لگا کر گویا ہوا۔

"ویلکم ہاشم بھتیجے...... ہارٹ لی ویلکم"..... بعد ازیں غزالہ نے والہانہ انداز سے ہاشم کو گلے لگایا اور بوسے دینے لگی۔

ہاشم بھی انکل اور آنٹی سے مل کر فرحاں وشاداں تھا۔ قمر بھی شادمانی سے سرشار تھا۔ غزالہ تو خوشی کے سمندر میں پور پور تک ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ قمر کے بھتیجے کو اپنا بیٹا سمجھ کر ملی تھی۔ قمر اس کا محسن بھی تھا اور سرتاج بھی۔ غزالہ اس کے احسان تلے اس لیے دبی ہوئی تھی کہ قمر نے آج تک اس کی کوکھ سے اولاد کے جنم نہ لینے کی بازپرس نہ کی تھی۔ اس نے ہر سکھ اسے دیا تھا اور ہر تکلیف میں اس کا ساتھ دیا تھا اس لیے غزالہ نے بھی قمر کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کی ہوئی تھیں۔ وہ اس پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھی۔

اب جبکہ اس کا بھتیجا آیا تھا۔ وہ اسے پا کر فضاؤں میں اڑ رہی تھی۔

ہاشم سے ملنے کے بعد غزالہ نے پیار سے کہا "ہاشم بیٹے! اب تم ہوسٹل میں نہیں رہو گے۔ اب تم ہمارے پاس رہ کر ہمارے من میں خوشیوں کے چراغ روشن کرو گے۔ کاش ہمیں پہلے علم ہوتا کہ ہمارا شہزادہ کوئین کالج میں پڑھتا ہے تو ہم ایک منٹ بھی اپنے پیارے

پھول کو ہوسٹل میں نہ رہنے دیتے۔ چلو آؤ بیٹا۔ گاڑی میں بیٹھو۔"

"لیکن آنٹی...." ہاشم لجا گیا اور کچھ نہ بول سکا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں...... آؤ گاڑی میں بیٹھو۔" غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹا چلو بھی.... کیا تم ہمیں خوشیوں کو گلے لگانے کا موقع نہیں دو گے۔ بیٹا جب سے تم نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا، تمہارا انکل تمہاری دید سے محروم رہا.... اب تو دل بھر کے دیکھ لینے دو۔" قمر نے قدرے دکھ سے کہا۔

ہاشم انکل کے آگے انکار نہ کر سکا اور چپکے سے آنٹی کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قمر نے خوشی سے ایکسیلیریٹر دبا دیا اور گاڑی لندن کی خوبصورت سڑکوں پر فرّاٹے بھرنے لگی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ گھر پہنچے۔ کال بیل دی تو نوکر نے مین گیٹ کھولا۔

قمر نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور پھر تینوں محبت بھرے جذبوں سے سرشار گھر میں داخل ہوئے۔ ہاشم نے جونہی گھر میں قدم رکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بادشاہ کے محل میں آگیا ہو۔ گھر کے چہار سو سبزہ زار، رنگ برنگے پھولوں کے پودے اور فضا خوشبو سے مہک رہی تھی..... وہ روش سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو تزئین و آرائش کو دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ خوبصورت صوفہ سیٹ، فرانسیسی دریچے، ایرانی قالین اور میچنگ پردے، خوبصورت شوکیس جس پر رنگ برنگے مختلف الانواع عجوبے سجے تھے۔ یہی حال کمروں کا تھا۔ وہ بھی قرینے سے سجائے گئے تھے۔ ہر بیڈ کے ساتھ ریڈیو، ٹیلیفون اور ٹی وی سیٹ موجود تھا۔

الغرض انکل کے محل نما گھر نے اسے مسحور و محظوظ کر دیا۔ وہ عش عش کر اٹھا اور والہانہ انداز سے آنٹی کو گلے لگا کر بولا "آنٹی، یو آر گریٹ۔ کس طرح آپ نے گھر کی تزئین و آرائش کر رکھی ہے..... اب میں ڈیانا کے غرور کا قلع قمع کروں گا۔ میں موقع ملتے ہی اسے اپنے گھر لاؤں گا۔ میرے گھر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اپنے آپ کو بڑی امیر سمجھتی ہے۔ اب میں دیکھوں گا۔" ہاشم فخریہ انداز سے بولا۔

"ارے یہ ڈیانا کون ہے؟" غزالہ نے تجسس سے پوچھا۔

"میری کلاس فیلو ہے۔" ہاشم نے جواب دیا۔

"پھر تو اسے ضرور لانا۔ ہم بھی اسے دیکھیں گے۔ بس بیٹا اب جاؤ غسل کر کے آؤ۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ ہم نے خوشی میں ناشتہ بھی نہیں کیا.... اب بیٹا آگیا ہے تو اپنے پیٹ کی آگ بجھائیں گے۔ ٹھیک ہے نا ہاشم بیٹا۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔" ہاشم نے مسرور لہجے میں کہا۔

پھر ہاشم فخریہ انداز میں چلتے چلتے باتھ روم میں گھس گیا۔

دوسرے روز ہاشم کالج گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اسے اپنا روم میٹ مہتاب کہیں نظر نہ آیا۔ وہ لندن میں سگے چچا کو پا کر بہت خوش تھا۔ وہ خوشی خوشی کالج گیا تھا۔ لیکن مہتاب کو کہیں بھی نہ پا کر اس کی شادمانی رفوچکر ہو گئی۔ اس روز ڈیانا بھڑکیلے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ اس کے حسن کی کرنوں نے کلاس روم کو بقعۂ نور و عطر بنا رکھا تھا۔ لیکن ہاشم کے من میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ مہتاب کیوں نہیں آیا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھا مہتاب کے کمرے میں گیا اور گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا تو اپنے سامنے مہتاب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ مہتاب انتہائی لاغر اور بیمار نظر آرہا تھا۔ پھر ہاشم نے لب کھولے "مہتاب یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"یار اندر آؤ تو بتاؤں گا۔" وہ مدھم آواز میں بولا۔ "کیا تم ائرپورٹ سے آرہے ہو۔" مہتاب نے پوچھا۔

"نہیں یار.... میں سیدھا کالج سے آرہا ہوں۔" ہاشم نے جواب دیا۔

"تو تم ہوسٹل کیوں نہیں آئے... کیا مجھ سے ناراض ہو کہ میں تمہیں ائرپورٹ لینے نہیں آیا۔"

"مہتاب تمہیں ائرپورٹ پر نہ دیکھ کر میرا دل رنجیدہ تو ہوا تھا... میں ناراض بھی تھا پر...."

"پر کیا..... بتاؤ تو سہی۔ پلیز کھل کر بات کرو۔" مہتاب نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"ارے میرے یار فکر نہ کرو میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور تم میری داستان سن کر خوش بھی ہو گے۔ لیکن پہلے میرے سوال کا جواب تو دو۔" ہاشم نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

"میرے بھائی' ایک ہفتے سے میں بخار میں مبتلا ہوں۔ آج بخار نارمل ہوا ہے لیکن کمزوری بہت ہے۔ انشااللہ چند روز کے اندر صحت یاب ہو جاؤں گا۔" مہتاب نے کمزور آواز میں کہا۔

چند ثانئے کے بعد مہتاب نے متجسس ہو کر پوچھا "ہاشم اب تم اپنی وہ داستان سناؤ کہ جس کی بنا پر تم خوشیوں کے پنکھ لگا کر فضاؤں میں اڑ رہے ہو۔"

ہاشم خوشی کے انداز میں گویا ہوا "ارے میرے پیارے دوست۔ ذرا دل کو تھام لو۔ میں اپنی فرحت آمیز داستان سنانے لگا ہوں۔ میں ایسٹر ہالیڈیز پر پاکستان گیا تو مجھے ابو نے بتایا کہ میرے سگے چچا جان عرصۂ دراز سے برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں تو میرے دل میں خوشیوں کے چراغ روشن ہو گئے۔"

پھر ہاشم نے والہانہ انداز میں مزید کہا "کل جب میں ائرپورٹ پہنچا تو مجھے ریسیو کرنے انکل قمر اور آنٹی غزالہ ائرپورٹ آئے ہوئے تھے۔ انہیں بابا جانی نے میرے پہنچنے کی شاید اطلاع کر دی ہو گی۔ میں انہیں مل کر بہت مسرور تھا۔ اسی شادمانی و انہونی کے مل جانے پر میں وقتی طور پر تمہیں بھول گیا تھا لیکن جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو مجھے تمہاری یاد نے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپایا.... اور صبح جب تمہیں کالج میں نہ دیکھا تو میرا دل گھائل ہو گیا... میں چھٹی ہونے پر سیدھا تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔" پھر وہ سوچتے ہوئے بولا "یار' انکل اور آنٹی پریشان ہوں گے کہ میں ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا' ذرا فون کر لوں۔ بقیہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ ٹھیک ہے نا۔"

"ٹھیک ہے..... بالکل ٹھیک۔" مہتاب خوش ہو کر بولا۔

ہاشم نے فی الفور نمبر ڈائل کیا تو آنٹی نے اٹھایا۔ "ہیلو غزالہ اسپیکنگ۔"

"آنٹی گڈ ایوننگ' میں ہاشم بول رہا ہوں۔"

"ارے تم کہاں ہو..... کہاں سے بول رہے ہو۔ خیریت سے تو ہو نا۔" غزالہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"آنٹی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے دوست کے پاس ہوں۔" ہاشم نے کہا۔

"گھر کب آ رہے ہو؟"

"آنٹی بس ایک گھنٹے تک آجاؤں گا۔"

"دوست کو بھی ساتھ لے آؤ۔"

"آنٹی وہ بیمار ہے.....شاید نہ آسکے۔" قاسم نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا تو فون اپنے دوست کو دو میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

ہاشم نے بسرعت فون مہتاب کو پکڑا دیا جو بڑے تجسّس سے ہاشم کی باتیں سن رہا تھا۔

"ہیلو.....میں ہاشم کی آنٹی بول رہی ہوں۔"

"السلام علیکم آنٹی۔"

"وعلیکم السلام بیٹا۔"

"بیٹا تم اور ہاشم فوراً ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم بے چینی سے تم دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"آنٹی میں تو بیمار ہوں۔ کیسے آسکتا ہوں۔"

"کیسے آسکتے ہو.....یہ میں بتاتی ہوں۔ لفٹ سے نیچے اترو..... ٹیکسی کرو اور سیدھے ہمارے گھر پہنچ جاؤ۔" غزالہ نے قدرے برہمی سے کہا اور فون رکھ دیا۔

ہاشم نے متحیر ہو کر پوچھا "مہتاب آنٹی نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔"

"آنٹی نے تو مارشل لا آرڈر دے دیا ہے کہ ہم دونوں فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں۔ اور اب ان کے پاس جانے کے سوا چارہ بھی نہیں..... میں چند منٹوں میں کپڑے بدلتا ہوں۔ پھر دونوں بھائی آنٹی کے آرڈر کی تکمیل کرتے ہیں۔" مہتاب نے خوش ہو کر جواب دیا۔

مہتاب جلدی سے تیار ہوا۔ آنٹی کے کہنے کے مطابق لفٹ سے باہر آیا۔ ٹیکسی ہائر کی اور دونوں دوست ڈرائیور کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

مہتاب انجانے تخیلات کے پر لگا کر اڑتا رہا حتیٰ کہ ٹیکسی رکی اور ہاشم بولا "ارے میرے یار ٹیکسی سے اترو..... میری آنٹی کا گھر آگیا ہے۔"

اچانک مہتاب گھبرا اٹھا۔ وہ آنکھیں ملنے لگا جیسے کہ خوابِ خرگوش سے بیدار ہوا ہو۔ اپنے سامنے محل نما بنگلے کو دیکھ کر گویا ہوا "ارے ہاشم یار میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ کیا میں واقعی جاگ رہا ہوں۔"

ہاشم نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہلکا سا دھپ لگاتے ہوئے کہا "یہ تو تم کو ہی معلوم ہوگا۔"

"ہاں یار..... میں جاگ رہا ہوں۔ لیکن یہ بنگلہ کس کا ہے؟" مہتاب نے تجسّس سے پوچھا۔

"یہ کوٹھی تمہارے اور میرے انکل کی ہے۔" ہاشم ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولا۔

دریں اثنا ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے پکی عمر کے ایک ہینڈسم شخص نمودار ہوئے جسے دیکھ کر مہتاب انگشت بدنداں ہو گیا۔ وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھنے لگا۔

ہاشم نے والہانہ انداز سے کہا "السلام علیکم انکل۔"

"وعلیکم سلام، جیتے رہو۔ ارے تم مجھے ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ رہے ہو..... کیا میں کوئی عجوبہ ہوں۔" قمر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"انکل مجھے شک پڑتا ہے کہ آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔" مہتاب نے حیرت سے آنکھیں پھیلائے ہوئے کہا۔

"ارے نادان..... میری شکل تمہارے دوست ہاشم سے ملتی جو ہے۔ اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" قمر نے برجستہ کہا۔

"نہیں انکل ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مہتاب آنکھیں پھیلا کر بولا جیسے کہ قمر کو پہچان رہا ہو۔

"انکل آپ گروپ فوٹو میں میرے ڈیڈی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ وہ فوٹو میرے ابو نے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا رکھا ہے۔"

"بیٹا..... وہ گروپ فوٹو ہاشم اور تمہارے ابو کا ہوگا..... ہاشم کے ابو عین بعین مجھ سے ملتے ہیں۔" پھر قمر نے کچھ سوچتے ہوئے مہتاب سے پوچھا "بیٹے تمہارے ابو کا نام شہباز خان

تو نہیں ہے۔"

مہتاب مسرور کن لہجے میں بولا "انکل آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں..... میرے ابو کا نام شہباز خان ہی ہے۔ آپ...... آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"ارے پگلے وہ اور میں گہرے دوست تھے۔ آپ کے ابو اسٹیشن ماسٹر گلاب خان کے بیٹے تھے۔ وہ چکوال سے تبدیل ہو کر آئے تھے۔ جب ہم دسویں میں پہنچے تو ان کی ترقی ہو گئی تھی۔ ترقی سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ برانچ لائن سے تبدیل ہو کر مین لائن لالہ موسیٰ ضلع گجرات کے اسٹیشن ماسٹر بن گئے تھے۔"

کہتے کہتے قمر رک گیا۔ وہ مغموم ہو گیا۔ پھر رنجور لہجے میں بولا "تمہارے دادا کا تبادلہ ہو جانے پر میں اور تمہارے ابو ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ میں بچپن سے پیرانہ سالی کے دور میں داخل ہو چکا ہوں لیکن اب تک مہربان و شفیق دوست سے ملاقات نہ ہو سکی۔"

اس کے بعد قمر نے بڑھ کر مہتاب کو گلے لگا لیا پھر تھوڑے توقف کے بعد چاہت بھرے لہجے میں پوچھا "مہتاب بیٹے، اب تمہارے ابو کہاں ہیں؟"

"انکل ائرفورس میں ہیں۔ آج کل ڈیپوٹیشن پر قطر میں ہیں۔ وہ ائر کموڈور ہیں۔" آفتاب نے بتایا۔

"ماشاءاللہ میرا جگری یار کموڈور بن گیا ہے۔" قمر خوش ہو کر بولا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد قمر نے پھر لب کھولے۔ "شہباز خان کو ائرفورس جوائن کر کے ملک کی خدمت کرنے کا بہت شوق تھا۔ آخر اس نے شوق پورا کر ہی لیا..."

پھر اس نے تجسّس بھرے انداز میں پوچھا "بیٹے کیا تمہیں ابو کا فون نمبر یاد ہے؟"

"جی انکل۔"

"ویری گڈ! تب تو میں اس سے ابھی اور اسی وقت فون پر بات کرتا ہوں۔"

پھر ہاشم کو افسردہ دیکھ کر قمر نے پوچھا۔

"ارے ہاشم تم منہ کیوں لٹکائے کھڑے ہو؟"

"انکل میں مہتاب سے ناراض ہوں۔ اس بے وقوف نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا

کہ یہ میرے ابو کو جانتا ہے۔"

مہتاب نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ارے نادان ہاشم جب میں نے تمہارے ابو کو دیکھا تک نہیں تو پھر میں تمہیں کیسے بتاتا کہ میں تمہارے ابو کو جانتا ہوں۔"

ہاشم مزید ناراضگی سے بولا "دیکھا کیوں نہیں۔ میرے ابو کی تصویر تو ہر وقت ہمارے کمرے میں دیوار کے ساتھ لٹکی رہتی ہے جس پر تقریباً روزانہ ہی تمہاری نظر ضرور پڑتی ہو گی۔"

اس نے بوکھلا کر پوچھا "تصویر تو میں نے دیکھی ہے لیکن میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔"

ہاشم نے ذرا تلخی سے کہا "تو تم نے میرے انکل کو کیسے پہچان لیا؟"

"اس لیے کہ وہ گروپ فوٹو میں میرے ابو کے ساتھ کھڑے ہیں۔" مہتاب نے ملائمت سے جواب دیا۔

"میرے ابو عین بعین انکل قمر سے ملتے ہیں۔ جیسے جڑواں بھائی ہیں.... تو پھر تم میرے ابو کو کیوں نہ پہچان سکے۔" ہاشم نے ذرا تلخی سے کہا۔

"او آئی سی۔ بھئی تمہارے ابو نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ جبکہ تمہارے انکل کلین شیو ہیں اس لیے میں نے انہیں فوراً پہچان لیا.... پلیز مجھے معاف کر دو۔"

"ہاں بیٹا مہتاب کو معاف کر دو۔ پھر آج یہ تمہارے لیے خوشی کا مقام ہے کہ آج تم جان چکے ہو کہ تمہارے انکل اور مہتاب کے ابو ایک دوسرے کے گہرے دوست رہے ہیں۔ وقت نے انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیا اور نویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکے.... اور یہ بھی ایک عجوبہ سے کم نہیں کہ تم دونوں بھی جگری یار ہو۔" قمر نے مہتاب کی وکالت کی۔

انکل کی دل گداز بات سنتے ہی ہاشم نے بڑھ کر اپنے دوست کو گلے لگا لیا۔ پھر وہ تینوں خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے۔

قمر مسرت سے سرشار ہو کر بولا "ارے غزالہ دیکھو تو سہی کون آیا ہے۔" پھر اس نے

مزید کہا "یک نہ شد دو شد۔"

"ارے قمر جانی..... میں مہتاب کو جانتی ہوں۔ میں نے ہی فون پر بیٹے جانی کو گھر آنے کی دعوت دی ہے۔ سمجھ گئے آپ۔" غزالہ نے خوشی سے پھولتے ہوئے کہا۔

اس روز غزالہ اور قمر بہت مسرور تھے۔ وہ خوش تھے کہ آج ان کے بیٹے کے ساتھ اس کا گہرا دوست بھی آیا تھا جس کا باپ بھی ہاشم کے انکل کا جگری یار تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد غزالہ نے مہتاب سے کہا "بیٹا کل تم بھی اپنا سامان یہیں لے آؤ۔ یہاں بھی تم دونوں ایک ہی ساتھ رہو گے۔"

"نہیں آنٹی۔" مہتاب مغموم لہجے میں بولا۔

"کیوں بیٹے؟"

"اس سے میری خودداری پر ضرب پڑتی ہے۔" مہتاب نے سر جھکا کر کہا۔

"او شیطان کہیں کا۔" غزالہ نے مسکرا کر کہا۔ "اوکے جیسی تمہاری مرضی لیکن چونکہ تم بیمار ہو اس لئے میں تمہیں اس وقت تک نہیں جانے دوں گی جب تک تم مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔" مہتاب نے خوش ہو کر کہا۔

ہاشم اور مہتاب دونوں انکل اور آنٹی کو کورنش بجا کر سونے کے لئے آراستہ و پیراستہ کمرے میں آ گئے۔ جہاں ٹیپ ریکارڈر' ٹی وی اور دیگر آرائشی سامان موجود تھا۔ انہوں نے آتے ہی فاسٹ دھنوں کی کیسٹ لگائی اور سنتے سنتے سو گئے۔

مہتاب مکمل صحت یاب ہونے تک آنٹی غزالہ کے گھر ہی رہا۔ وہ آنٹی غزالہ کو پا کر بہت ہی شاداں تھا۔ وہ آنٹی کا گھر تو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن عزتِ نفس نے اس کی آرزو کے آگے بند باندھ دیا۔ وہ بادلِ نخواستہ آنٹی کا گھر چھوڑ کر آ گیا لیکن وہ ہر ہفتے کی رات وہاں ضرور رہتا اور آنٹی' انکل اور اپنے دوست کی چاہتوں کو گلے لگاتا۔

قمر اور غزالہ بے اولاد تھے۔ اب انہیں پلا پلایا بیٹا مل گیا تھا ہاشم کے روپ میں۔ ان کے ویران آنگن میں بہاریں رقص کر رہی تھیں۔ چاروں طرف خوشی کے غنچے مسکرا رہے

تھے۔ ان دونوں نے ہاشم کو اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرانے کی غرض سے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ جس میں اپنے دوستوں معززین کے علاوہ انہوں نے ڈیانا کو بھی مدعو کیا۔ ڈیانا کو دعوت دینے کی آرزو ہاشم کی تھی کیونکہ وہ اسے اپنے گھر بلا کر اپنے محل نما گھر کی زیبائی و خوبصورتی سے مرعوب و متاثر کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی محبت کے گیت گانے لگے۔ جبکہ قمر اور غزالہ کی آرزو تھی کہ وہ اس پری پیکر لڑکی کو دیکھیں کہ جس نے ان کے بیٹے کا دل مٹھی میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے مہتاب کو ڈیانا کے گھر جانے اور اسے تقریب میں شرکت کے لئے دعوتی کارڈ دینے کے لئے کہا۔

مہتاب نے کال بیل پر انگلی رکھی تو ڈیانا نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ گُل ہزارہ تھی۔ مہتاب اپنے سامنے ڈیانا کو کھڑا دیکھ کر کھل اٹھا۔ ڈیانا مہتاب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی کیونکہ پوری کلاس میں وہ خاموش طبع اور جامہ زیب لڑکا تھا۔

ڈیانا اپنے روبرو مہتاب کو دیکھ کر چہک اٹھی اس کے تن کی پنکھڑیاں مسکرانے لگیں۔ وہ خوشیوں سے جھوم کر بولی "زہے نصیب' آج ہمارے در پر مہتاب صاحب آئے ہیں۔ آیئے مہتاب صاحب اندر آیئے' آیئے نا۔"

"نہیں ڈیانا..... آج میں ذرا جلدی میں ہوں... پھر کبھی آؤں گا۔" وہ زیرِ لبی خنداں سے بولا۔

"اوکے مہتاب صاحب۔ جیسے آپ کی مرضی..... لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کا آنا کیسے ہوا؟" ڈیانا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔" مہتاب نے کارڈ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈیانا نے کارڈ آناً فاناً کھولا اور پڑھنے کے بعد ملائمت سے گویا ہوئی "اوکے مہتاب صاحب..... میں ضرور آؤں گی۔"

مہتاب نے کورنش کے انداز میں سلام کیا اور واپس لوٹ آیا۔

ڈیانا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور خیالوں ہی خیالوں میں سوچنے لگی "اگر الیگزینڈر میری زندگی میں نہ آیا ہوتا تو میں اس شریف النفس کو اپنی انگشتریِ حیات کا نگینہ بنا لیتی۔"

ہاشم کی تقریبِ مسرت کا دن بھی آگیا۔ ہاشم کے بہت سے کلاس فیلو بمع مہتاب اور ڈیانا نے اس پُر بہار تقریب میں شرکت کی۔ وسیع و کشادہ ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش پر پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا تھا۔ وہ خوشبودار پھولوں کی لڑیوں اور رنگ برنگے قمقموں سے جھلملا رہا تھا۔ ایسے میں بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس خوبرو شرکائے محفل، خوبصورت مغربی دھنوں پر رقص کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جام چھلک رہے تھے۔ اس خواب آگیں ماحول میں ڈیانا ستاروں کی کہکشاں میں چاند لگ رہی تھی۔ ایسے میں ہاشم مخمور و مسحور ہو کر ڈیانا کی طرف بڑھا۔ اس کے لب بوسہ دینے کے لئے حرکت میں آئے۔ ڈیانا کے گلابی رخساروں سے دو انچ کا فاصلہ رہتا ہو گا کہ ہاشم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بھڑکتے شعلوں نے اس کا استقبال کیا ہو۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

وہ حیران پریشان کھڑا تھا کہ ڈیانا پیار سے بولی "کیا ہوا، ہاشم کیا ہوا.....؟ تمہارے چہرے پر شبنمی قطرں نے ڈیرا جمالیا....." پھر اس نے جینز سے رومال نکالا اور ہاشم کے چہرے کو پونچھنے لگی۔ دریں اثنا موسیقی کی مدھر دھنیں بند ہو گئیں اور تمام شرکا نے ہاشم اور ڈیانا کو دائرے میں لے لیا اور ایک زبان ہو کر بولے "کیا ہوا... کیا ہوا؟"

ہاشم اپنی حماقت پر نادم تھا۔ وہ اپنی طرف لپکتے ہوئے انجانے شعلوں کی نوعیت کو نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ خوابِ کیف سے بیدار ہوا تو پژمردہ ہو کر بولا "مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔"

تھوڑی دیر کی تسلی و تشفی کے بعد خاطر تواضع کا دَور چلا اور تمام شرکائے تقریب پیٹ پوجا کر کے چلے گئے ماسوا ڈیانا کے۔

چند ثانیوں کے بعد غزالہ نے پیار بھرے انداز میں کہا "ڈیانا، میرا بیٹا ہاشم تم سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔"

"آنٹی میں بھی ہاشم کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں۔ ہاشم مجھے بہت اچھا لگتا ہے یہ میرے ننھے دل کے آنگنائی میں بستا ہے۔ اس کے وجود سے میرے من کی دنیا آباد ہے۔"

ڈیانا اپنی بات کو بڑھاتے ہوئے بولی۔ "لیکن آنٹی مجھے ہاشم سے روحانی پیار ہے، سچا

پیار۔"

"لیکن ہاشم نے تو تمہیں پروپوز کیا ہے۔" غزالہ نے ہنس کر کہا۔

"آنٹی چھوڑیں ان چونچلوں کو۔ مرد حضرات تو ایسے ہی شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔"

ڈیانا نے اپنے گیسو جھٹکے اور آنٹی سے اجازت لے کر باہر آگئی۔ غزالہ اس خوبرو حسینہ کو دیکھتی رہ گئی۔

ڈیانا کے چلے جانے کے بعد ہاشم متفکر لہجے میں بولا "آنٹی، میں ڈیانا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے پیار تو کرتی ہے لیکن اس کی چاہت میں انوکھا پن ہے۔"

پھر وہ سوچتے ہوئے گویا ہوا "ایک بات پر مجھے بھی تعجب ہوتا ہے کہ میں بھی اس سے کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ میں جب بھی چاہتا ہوں کہ اس سے اظہارِ محبت کروں، محبوب بن کر اس کے حضور کورنش بجالاؤں تو میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ در پردہ اس میں کیا راز پنہاں ہے۔"

"بیٹے فکر نہ کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لگتا ہے تم پر نفسیاتی دباؤ ہے کیونکہ وہ تم سے کھل کر اظہارِ محبت نہیں کرتی اس لئے تم بھی لفٹ نہ پا کر اپنا مدعا نوکِ زبان پر نہیں لا سکتے۔" غزالہ نے تشفی دیتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹا سو جاؤ۔" غزالہ نے ہاشم کی پیٹھ پر تھپکی لگاتے ہوئے کہا۔

ماہ و سال پر لگا کر اڑتے رہے۔ ہاشم کا فائنل امتحان ہوا۔ ہاشم، ڈیانا، الیگزینڈر تینوں جی۔ پی اے تھری گریڈ بی میں پاس ہو گئے جبکہ مہتاب جی پی اے فور گریڈ اے میں پاس ہوا۔ اسے اپنی لیاقت و ذہانت کے بل بوتے پر ایک بڑے بینک میں ایریا منیجر کی آفر مل گئی جسے اس نے قبول کر لیا اور پریکٹیکل ٹریننگ کے لئے بینک کی ایک مقامی برانچ کو جوائن کر لیا۔

ہاشم اپنے والدین کے پاس پاکستان جانا چاہتا تھا۔ اسے برطانیہ میں سروس کرنے میں قطعی دلچسپی نہ تھی لیکن پاکستان سدھارنے سے قبل اس کی قلبی آرزو تھی کہ ڈیانا سے اس کی منگنی ہو جائے۔

پیار۔"

"لیکن ہاشم نے تو تمہیں پروپوز کیا ہے۔" غزالہ نے ہنس کر کہا۔

"آنٹی چھوڑیں ان چونچلوں کو۔ مرد حضرات تو ایسے ہی شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔"

ڈیانا نے اپنے گیسو جھٹکے اور آنٹی سے اجازت لے کر باہر آگئی۔ غزالہ اس خوبرو حسینہ کو دیکھتی رہ گئی۔

ڈیانا کے چلے جانے کے بعد ہاشم متفکر لہجے میں بولا "آنٹی' میں ڈیانا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے پیار تو کرتی ہے لیکن اس کی چاہت میں انوکھا پن ہے۔"

پھر وہ سوچتے ہوئے گویا ہوا "ایک بات پر مجھے بھی تعجب ہوتا ہے کہ میں بھی اس سے کھل کر بات نہیں کرسکتا۔ میں جب بھی چاہتا ہوں کہ اس سے اظہارِ محبت کروں' محبوب بن کر اس کے حضور کورنش بجالاؤں تو میری زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ درپردہ اس میں کیا راز پنہاں ہے۔"

"بیٹے فکر نہ کرو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ لگتا ہے تم پر نفسیاتی دباؤ ہے کیونکہ وہ تم سے کھل کر اظہارِ محبت نہیں کرتی اس لئے تم بھی لفٹ نہ پاکر اپنا مدعا نوکِ زبان پر نہیں لاسکتے۔" غزالہ نے تشفی دیتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹا سوجاؤ۔" غزالہ نے ہاشم کی پیٹھ پر تھپکی لگاتے ہوئے کہا۔

ماہ و سال پر لگا کر اڑتے رہے۔ ہاشم کا فائنل امتحان ہوا۔ ہاشم' ڈیانا' الیگزینڈر تینوں جی پی اے تھری گریڈ بی میں پاس ہوگئے جبکہ مہتاب جی پی اے فور گریڈ اے میں پاس ہوا۔ اسے اپنی لیاقت و ذہانت کے بل بوتے پر ایک بڑے بینک میں ایریا منیجر کی آفر مل گئی جسے اس نے قبول کرلیا اور پریکٹیکل ٹریننگ کے لئے بینک کی ایک مقامی برانچ کو جوائن کرلیا۔

ہاشم اپنے والدین کے پاس پاکستان جانا چاہتا تھا۔ اسے برطانیہ میں سروس کرنے میں قطعی دلچسپی نہ تھی لیکن پاکستان سدھارنے سے قبل اس کی قلبی آرزو تھی کہ ڈیانا سے اس کی منگنی ہوجائے۔

قمر نے اپنے بھتیجے کو رنجور و ملول دیکھا تو مضطرب ہو کر بولا "ہاشم بیٹا' افسردہ کیوں بیٹھے ہو۔ کیا آنٹی نے کچھ کہہ دیا ہے یا کسی بات پر کوئی جھگڑا ہوا ہے۔"

"نہیں ابو..... جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا..... لیکن امی مجھ سے ناراض ہوگئی ہیں۔"

قمر نے ہاشم کے منہ سے ابو اور امی کے الفاظ سنے تو اس کی نس نس میں شادمانی کی لہر دوڑنے لگی۔ وہ خوشی سے سرشار ہو کر بولا "بیٹا تم نے مجھے ابو اور غزلہ کو امی کہا ہے کیا یہ سچ ہے۔ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ضرور میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں.... بیٹا مجھے جھنجوڑ کر یقین دلاؤ کہ میں کوئی سپنا نہیں دیکھ رہا....."

قمر بولے ہی جارہا تھا کہ ہاشم بڑھ کر چچا کے گلے لگ گیا اور شبنمی آنکھوں سے بولا "ابو ..... یہ حقیقت ہے..... حقیقت۔"

"تھینک یو ہاشم بیٹا! تھینک یو۔"

قمر نے کچھ دیر تک ہاشم کو سینے سے دبوچے رکھا۔ دل ہی دل میں رب ذوالجلال کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ جس نے اس پر رحمت کے دروازے کھول کر اسے بیٹے سے ملادیا تھا اور بیٹے نے اسے ابو کہنا بھی شروع کردیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر قمر نے ہاشم کو گلے لگائے رکھا۔ وہ اپنے سہانے خوابوں کی ندیا سے تب نکلا جب اس کے کانوں میں غزالہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بسرعت اس کے کمرے کی جانب لپکا۔ کمرہ اندر سے بند تھا اور غزالہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

قمر پریشان ہوگیا۔ وہ رنجور ہو کر بولا "غزالہ دروازہ کھولو.... پلیز دروازہ کھولو۔" غزالہ نے دروازہ نہ کھولا اور متواتر روتی رہی۔

دریں اثنا ہاشم نے چاہت بھری آواز میں کہا "امی' امی' پلیز کنڈی کھولو۔ امی پلیز۔"

ہاشم کی امی' امی کی میٹھی آواز غزالہ کے کانوں میں پڑی تو اسے اپنے کانوں میں امرت کا رس گھلتا محسوس ہوا۔ اس کے من میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ وہ فی الفور پلنگ سے اٹھی۔ دیوانوں کی مانند دروازے کی طرف لپکی اور کواڑ کھول دیا۔

اپنے سامنے ہاشم کو آنکھوں میں موتی سجائے دیکھا تو بیٹا بیٹا کہہ کر اس کے گلے لگ گئی۔

قمر نے اپنے بھتیجے کو رنجور و ملول دیکھا تو مضطرب ہو کر بولا "ہاشم بیٹا' افسردہ کیوں بیٹھے ہو۔ کیا آنٹی نے کچھ کہہ دیا ہے یا کسی بات پر کوئی جھگڑا ہوا ہے۔"

"نہیں ابو..... جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا..... لیکن امی مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں۔"

قمر نے ہاشم کے منہ سے ابو اور امی کے الفاظ سنے تو اس کی نس نس میں شادمانی کی لہر دوڑنے لگی۔ وہ خوشی سے سرشار ہو کر بولا "بیٹا تم نے مجھے ابو اور غزلہ کو امی کہا ہے کیا یہ سچ ہے۔ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ضرور میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں..... بیٹا مجھے جھنجوڑ کر یقین دلاؤ کہ میں کوئی سپنا نہیں دیکھ رہا....."

قمر بولے ہی جا رہا تھا کہ ہاشم بڑھ کر چچا کے گلے لگ گیا اور شبنمی آنکھوں سے بولا "ابو ..... یہ حقیقت ہے..... حقیقت۔"

"تھینک یو ہاشم بیٹا! تھینک یو۔"

قمر نے کچھ دیر تک ہاشم کو سینے سے دبوچے رکھا۔ دل ہی دل میں رب ذوالجلال کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ جس نے اس پر رحمت کے دروازے کھول کر اسے بیٹے سے ملا دیا تھا اور بیٹے نے اسے ابو کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر قمر نے ہاشم کو گلے لگائے رکھا۔ وہ اپنے سہانے خوابوں کی ندیا سے تب نکلا جب اس کے کانوں میں غزالہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بسرعت اس کے کمرے کی جانب لپکا۔ کمرہ اندر سے بند تھا اور غزالہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

قمر پریشان ہو گیا۔ وہ رنجور ہو کر بولا "غزالہ دروازہ کھولو..... پلیز دروازہ کھولو۔" غزالہ نے دروازہ نہ کھولا اور متواتر روتی رہی۔

دریں اثنا ہاشم نے چاہت بھری آواز میں کہا "امی' امی' پلیز کنڈی کھولو۔ امی پلیز۔"

ہاشم کی امی' امی کی میٹھی آواز غزالہ کے کانوں میں پڑی تو اسے اپنے کانوں میں امرت کا رس گھلتا محسوس ہوا۔ اس کے من میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ وہ فی الفور پلنگ سے اٹھی۔ دیوانوں کی مانند دروازے کی طرف لپکی اور کواڑ کھول دیا۔

اپنے سامنے ہاشم کو آنکھوں میں موتی سجائے دیکھا تو بیٹا بیٹا کہہ کر اس کے گلے لگ گئی۔

اسے مضبوطی سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں قیدی بھاگ نہ جائے۔ وہ اپنے سینے کی تپش سے اس کے دل کو پگھلانا چاہتی تھی۔

لیکن وہ تو پہلے ہی موم بن چکا تھا۔ پھر بھی غزالہ نے اس وقت تک ہاشم کو اپنی بانہوں میں جکڑے رکھا جب تک اس کے اپنے سینے کی آگ سرد ہو کر بجھ نہ گئی۔ پھر اس نے والہانہ انداز میں ہاشم کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔

پھر وہ خوشی سے چہکی "قمر جانی.... چلو گاڑی نکالو.... آج ہم بیٹے کی خوشیوں کو گلے کی مالا بنانے کی غرض سے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔"

پھر وہ تینوں تیزی سے پورچ میں آئے۔ وہ کار میں بیٹھے۔ غزالہ نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی' کار کو مین گیٹ سے نکال کر سڑک پر لائی اور پھر بی ایم ڈبلیو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوٹل کی طرف دوڑنے لگی۔ غزالہ اپنی سفید کار کو تیزی سے چلا رہی تھی۔ آج اس کا دل بھی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ بھی گاڑی کے ساتھ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

ایک مرحلے پر قمر نے نحیف آواز میں کہا "ہاشم کی امی گاڑی آہستہ چلاؤ۔"

غزالہ مچل کر بولی "ہاشم کے ابو آج میں خود فضاؤں میں اڑی جا رہی ہوں۔ پلیز آج مجھے مسرتوں کی پُربہار فضاؤں میں اڑنے سے مت روکو۔"

پھر وہ ہوٹل میں پہنچ گئے۔ تینوں نے طرح طرح کی کھانے کی ڈشوں سے پیٹ کو بھرا.... غزالہ نے تو ہاشم کو گلے لگا کر رقص بھی کیا۔ پھر وہ خوشیوں کو گلے لگا کر گھر واپس آ گئے۔

اب ان کا گھر گھر نہیں تھا۔ بہشت بن چکا تھا۔ بہشت.... اب وہ فردوس نما گھر میں خوش و خرم رہنے لگے اور شب و روز اپنی مخصوص رفتار سے مسافت طے کرنے لگے۔

○☆○

اسے مضبوطی سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اسے خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں قیدی بھاگ نہ جائے۔ وہ اپنے سینے کی تپش سے اس کے دل کو پگھلانا چاہتی تھی۔

لیکن وہ تو پہلے ہی موم بن چکا تھا۔ پھر بھی غزالہ نے اس وقت تک ہاشم کو اپنی بانہوں میں جکڑے رکھا جب تک اس کے اپنے سینے کی آگ سرد ہو کر بجھ نہ گئی۔ پھر اس نے والہانہ انداز میں ہاشم کی بلائیں لینی شروع کردیں۔

پھر وہ خوشی سے چہکی "قمر جانی.... چلو گاڑی نکالو.... آج ہم بیٹے کی خوشیوں کو گلے کی مالا بنانے کی غرض سے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔"

پھر وہ تینوں تیزی سے پورچ میں آئے۔ وہ کار میں بیٹھے۔ غزالہ نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی، کار کو مین گیٹ سے نکال کر سڑک پر لائی اور پھر بی ایم ڈبلیو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوٹل کی طرف دوڑنے لگی۔ غزالہ اپنی سفید کار کو تیزی سے چلا رہی تھی۔ آج اس کا دل بھی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ بھی گاڑی کے ساتھ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

ایک مرحلے پر قمر نے نحیف آواز میں کہا "ہاشم کی امی گاڑی آہستہ چلاؤ۔"

غزالہ مچل کر بولی "ہاشم کے ابو آج میں خود فضاؤں میں اڑی جا رہی ہوں۔ پلیز آج مجھے مسرتوں کی پُربہار فضاؤں میں اڑنے سے مت روکو۔"

پھر وہ ہوٹل میں پہنچ گئے۔ تینوں نے طرح طرح کی کھانے کی ڈشوں سے پیٹ کو بھرا.... غزالہ نے تو ہاشم کو گلے لگا کر رقص بھی کیا۔ پھر وہ خوشیوں کو گلے لگا کر گھر واپس آگئے۔

اب ان کا گھر گھر نہیں تھا۔ بہشت بن چکا تھا۔ بہشت.... اب وہ فردوس نما گھر میں خوش و خرم رہنے لگے اور شب و روز اپنی مخصوص رفتار سے مسافت طے کرنے لگے۔

○☆○

چند لمحوں کے بعد آفتاب دھیمی آواز میں بولا "یہاں ایک کوہ قاف کی پری شمائلہ، ہاشم کے سحر میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ وہ اسے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ٹرانسپورٹر کی بیٹی ہے۔ میں اور تمہاری بھابی بھی اسے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہماری بھی کچھ آرزوئیں ہیں۔ ایسے میں ہم اسے غیر دیس میں شادی کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک فرنگی لڑکی کے ساتھ۔"

"لیکن بھائی جان اگر ہم نے ہاشم کو ڈیانا کے خوشبودار بالوں کا قیدی نہ بنایا تو.... سرکش اسپ باگیں توڑ کر کہیں دور بھاگ جائے گا اور پھر ہم کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے شادی کی لگام ڈال کر سرکش و خستہ حال ہونے سے بچالیں۔"

آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے دل نے کہا۔ "آفتاب بہتر ہے کہ تم حالات سے سمجھوتہ کرلو...؟" غزالہ نے بھی یہی کہا۔

دریں اثنا قمر نے دل گیر آواز میں کہا "بھائی جان خاموش کیوں ہیں.... پلیز جواب دیں.... پلیز۔"

آفتاب نے افسردگی کا لبادہ اوڑھ کر کہا "او کے قمر۔" اور فون رکھ دیا۔

غزالہ نے حسرت بھرے انداز میں پوچھا "کیا کہا بھائی جان نے۔"

"بھائی جان نے ہاشم اور ڈیانا کی شادی کی اجازت تو دے دی ہے لیکن وہ مسرور نہیں تھے۔ دیکھیں اب ہاشم کو ڈیانا کیا جواب دیتی ہے۔" قمر نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

○☆○

چند لمحوں کے بعد آفتاب دھیمی آواز میں بولا "یہاں ایک کوہ قاف کی پری شائلہ' ہاشم کے سحر میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ وہ اسے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ٹرانسپورٹر کی بیٹی ہے۔ میں اور تمہاری بھابی بھی اسے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہماری بھی کچھ آرزوئیں ہیں۔ ایسے میں ہم اسے غیر دیس میں شادی کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک فرنگی لڑکی کے ساتھ۔"

"لیکن بھائی جان اگر ہم نے ہاشم کو ڈیانا کے خوشبودار بالوں کا قیدی نہ بنایا تو.... سرکش اسپ باگیں توڑ کر کہیں دور بھاگ جائے گا اور پھر ہم کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے شادی کی لگام ڈال کر سرکش وخستہ حال ہونے سے بچالیں۔"

آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے دل نے کہا۔ "آفتاب بہتر ہے کہ تم حالات سے سمجھوتہ کرلو...!" غزالہ نے بھی یہی کہا۔

دریں اثنا قمر نے دل گیر آواز میں کہا "بھائی جان خاموش کیوں ہیں..... پلیز جواب دیں.... پلیز۔"

آفتاب نے افسردگی کا لبادہ اوڑھ کر کہا "او کے قمر۔" اور فون رکھ دیا۔

غزالہ نے حسرت بھرے انداز میں پوچھا "کیا کہا بھائی جان نے۔"

"بھائی جان نے ہاشم اور ڈیانا کی شادی کی اجازت تو دے دی ہے لیکن وہ مسرور نہیں تھے۔ دیکھیں اب ہاشم کو ڈیانا کیا جواب دیتی ہے۔" قمر نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

○☆○

رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم نہایت سہانا تھا۔ ایسے میں ہاشم بھی امید کے ابرِ کرم میں بھیگتا اپنے محبوب کے در پر حاضر ہوا۔ امید و ناامیدی کے امتزاج سے کال بیل بجائی۔

چند لمحات کے بعد ڈیانا کی ماں نے دروازہ کھولا۔ اس نے اشتیاق بھرے انداز سے ہاشم کو دیکھا اور ملائمت سے کہا "یس سن' ہاؤ آر یو.... ہو یو ہیو کم۔"

ہاشم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آنٹی ڈیانا گھر میں ہے؟"

"یس ہنی۔" الزبتھ نے خندہ زیرلبی کہا اور اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔

چند ثانئے کے بعد ڈیانا پینٹ اور سفید قمیص پہنے آگئی۔ وہ کوہ قاف کی پری کو دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ڈیانا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ڈیانا نے دیکھا کہ ہاشم تو صرف اسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا ہے اور بولتا کچھ نہیں تو اس نے اپنے ہونٹوں کی کلی کو جنبش دی "یس ہاشم ہاؤ یو کم۔"

"میں میں......" وہ ہکلانے لگا۔

"ہاشم بولو......پلیز بولو نا۔" ڈیانا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

ہاشم کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچوں میں مستغرق تھا کہ آخر کیوں وہ اپنے محبوب کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں نہیں دیکھ سکتا.... آخر بڑی مشکل سے وہ بول پایا۔

"ڈیانا....میں.....میں..... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں قمر نہیں..... میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" ڈیانا نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟"

رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم نہایت سہانا تھا۔ ایسے میں ہاشم بھی امید کے ابرِ کرم میں بھیگتا اپنے محبوب کے در پر حاضر ہوا۔ امید و ناامیدی کے امتزاج سے کال بیل بجائی۔

چند لمحات کے بعد ڈیانا کی ماں نے دروازہ کھولا۔ اس نے اشتیاق بھرے انداز سے ہاشم کو دیکھا اور ملائمت سے کہا "یس سن' ہاؤ آر یو.... ہویو ہیوکم۔"

ہاشم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آنٹی ڈیانا گھر میں ہے؟"

"یس ہنی۔" الزبتھ نے خندہ زیر لبی کہا اور اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ چند ثانیے کے بعد ڈیانا پینٹ اور سفید قمیص پہنے آ گئی۔ وہ کوہ قاف کی پری کو دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ڈیانا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ڈیانا نے دیکھا کہ ہاشم تو صرف اسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا ہے اور بولتا کچھ نہیں تو اس نے اپنے ہونٹوں کی کلی کو جنبش دی "یس ہاشم ہاؤ یو کم۔"

"میں میں......" وہ ہکلانے لگا۔

"ہاشم بولو......پلیز بولو نا۔" ڈیانا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

ہاشم کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچوں میں مستغرق تھا کہ آخر کیوں وہ اپنے محبوب کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں نہیں دیکھ سکتا.... آخر بڑی مشکل سے وہ بول پایا۔

"ڈیانا...میں....میں..... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں قمر نہیں..... میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" ڈیانا نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟"

بات۔" قمر نے دھیمی و میٹھی آواز میں کہا۔

"لیکن انکل...پہلے کچھ کھائیں گے....پھر باتیں کریں گے۔" ڈیانا نے اپنی جھیل نما آنکھوں کو پھیلا کر کہا۔

قمر ڈیانا کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں محبت و چاہت کے روشن دیئے سے اپنے من کو منور کرتے ہوئے گویا ہوا "ڈیانا تمہاری پیاری صورت کو دیکھ کر میری پیاس رفو چکر ہو گئی ہے.....ابھی پُر نور و عطر فضا سے اپنے ذہن و قلب کو مہکانا چاہتا ہوں.....کیا میری بیٹی میری ننھی سی خواہش کو پورا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔"

"کیوں نہیں انکل..... آپ کو دیکھ کر مجھے تو ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ آپ میرے حقیقی باپ ہوں۔ میں تو آپ پر جان نچھاور کر سکتی ہوں.... آپ حکم تو کریں۔"

قمر جھجکتے ہوئے بولا "بیٹی میں تمہیں محبت کی زنجیر میں باندھ کر ہاشم کے دل کے زنداں میں ڈالنا چاہتا ہوں۔"

قمر کے ارشاد کو سن کر ڈیانا کملا گئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس نے لب ہلانے چاہے لیکن اسے دقت پیش آئی۔ پھر اس نے ایک گھونٹ پانی کا پیا اور ملائمت سے بولی۔

"انکل...... انکل یقین کریں...... جیسے آپ سے مجھے باپ کے پیار کی خوشبو آتی ہے ایسے ہی ہاشم کے بدن سے بھائی کی مہک آتی ہے۔ میں اس کی سگند سے مہک اٹھتی ہوں' میرے انگ انگ میں طرب و طمانیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں خوشی کے پر لگا کر فضاؤں میں اڑنے لگتی ہوں۔"

"بیٹی' تخیلات کے تانے بانے بننے سے خواب حقیقت کا روپ تو نہیں دھار سکتے۔ تم اس کی منہ بولی بہن تو بن سکتی ہو..... لیکن حقیقی بہن نہیں..... منہ بولی بہن بھی اس صورت میں بن سکتی ہو اگر ہاشم چاہتا ہو..... جب کہ ہاشم آرزو مند ہے کہ تم چاندنی کا روپ دھار کر اس کے دل کی آنگنائی میں اتر آؤ اور اجالا بکھیر دو۔" قمر نے ڈیانا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں انکل نہیں.... میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی.....میں ہمشیرہ کے روپ میں بھی اس کے دل میں پُر نور کرنیں منتشر کر سکتی ہوں۔" ڈیانا نے رنجور ہو کر کہا۔

بات۔" قمر نے دھیمی و میٹھی آواز میں کہا۔

"لیکن انکل... پہلے کچھ کھائیں گے.... پھر باتیں کریں گے۔" ڈیانا نے اپنی جھیل نما آنکھوں کو پھیلا کر کہا۔

قمر ڈیانا کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں محبت و چاہت کے روشن دیئے سے اپنے من کو منور کرتے ہوئے گویا ہوا "ڈیانا تمہاری پیاری صورت کو دیکھ کر میری پیاس رفو چکر ہو گئی ہے..... ابھی پُر نور و عطر فضا سے اپنے ذہن و قلب کو مہکانا چاہتا ہوں..... کیا میری بیٹی میری ننھی سی خواہش کو پورا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔"

"کیوں نہیں انکل..... آپ کو دیکھ کر مجھے تو ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ آپ میرے حقیقی باپ ہوں۔ میں تو آپ پر جان نچھاور کر سکتی ہوں.... آپ حکم تو کریں۔"

قمر جھجکتے ہوئے بولا "بیٹی میں تمہیں محبت کی زنجیر میں باندھ کر ہاشم کے دل کے زنداں میں ڈالنا چاہتا ہوں۔"

قمر کے ارشاد کو سن کر ڈیانا کملا گئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس نے لب ہلانے چاہے لیکن اسے دقت پیش آئی۔ پھر اس نے ایک گھونٹ پانی کا پیا اور ملائمت سے بولی۔

"انکل...... انکل یقین کریں...... جیسے آپ سے مجھے باپ کے پیار کی خوشبو آتی ہے ایسے ہی ہاشم کے بدن سے بھائی کی مہک آتی ہے۔ میں اس کی سگند سے مہک اٹھتی ہوں، میرے انگ انگ میں طرب و طمانیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں خوشی کے پر لگا کر فضاؤں میں اڑنے لگتی ہوں۔"

"بیٹی، تخیلات کے تانے بانے بننے سے خواب حقیقت کا روپ تو نہیں دھار سکتے۔ تم اس کی منہ بولی بہن تو بن سکتی ہو..... لیکن حقیقی بہن نہیں.... منہ بولی بہن بھی اس صورت میں بن سکتی ہو اگر ہاشم چاہتا ہو.... جب کہ ہاشم آرزو مند ہے کہ تم چاندنی کا روپ دھار کر اس کے دل کی آنگنائی میں اتر آؤ اور اجالا بکھیر دو۔" قمر نے ڈیانا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں انکل نہیں.... میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی.... میں ہمشیرہ کے روپ میں بھی اس کے دل میں پُر نور کرنیں منتشر کر سکتی ہوں۔" ڈیانا نے رنجور ہو کر کہا۔

"ڈیانا بیٹی تمہارا معاشرہ، کلچر، روایات و مذہبی رسومات ہم سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ پھر تم دونوں بہن بھائی کیسے بن سکتے ہو؟" قمر نے استدلالیہ انداز اختیار کیا۔

"انکل پلیز میری امنگوں کا قتل مت کیجئے۔ میری پُر بہار خوشیوں کو روندنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کی باتوں سے میرا دل گھبرا رہا ہے... میری آنکھوں کی روشنی مدھم ہو رہی ہے...." ڈیانا روہانسی ہو کر بولی "میں ہاشم کو بھائی سمجھتی ہوں..... بھائی..... بھائی۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈیانا کی ماں الزبتھ جو دروازے کی اوٹ میں کھڑی قمر اور ڈیانا کی باتیں سن رہی تھی اور قمر کو پہچان چکی تھی، بیٹی کو روتے دیکھ کر جھٹ اندر آ گئی اور طیش میں آ کر بولی۔

"قمر صاحب..... میں آپ کو بتاتی ہوں..... سب کچھ بتاتی ہوں..... تھوڑا انتظار کرو۔"

الزبتھ نے پیار سے اپنی بیٹی کو اٹھایا اور اسے اپنے بیڈ روم میں لٹا آئی۔

چند لمحات کے بعد الزبتھ سٹنگ روم میں داخل ہوئی اور زخمی شیرنی کی مانند گرجی "رذیل تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم ہمارے گھر میں آ گئے.... تم رذیل سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں مانچسٹر چھوڑ کر لندن آ گئی تاکہ آرام و سکون سے جی سکوں لیکن برسہا برس گزرنے کے بعد تم میری بہار بھری زندگی میں پھر خزاں کا بیج بونے آ گئے ہو۔"

ماں کی غصہ بھری باتیں سن کر ڈیانا چونکی اور وہ دبے قدموں کے ساتھ چل کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی اور باتیں سننے لگی۔

الزبتھ نے غصے بھرے انداز میں کہا "قمر، تم مسلمان لوگوں کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے نا۔ اب کہاں گیا تمہارا مذہب، تمہارے مذہب سے تو ہمارا عیسائی مذہب کتنا اچھا ہے.... اب تم خود ہی دیکھ لو کہ ایک عیسائی لڑکی ہاشم کو اپنا بھائی سمجھتی ہے جبکہ ہاشم اپنے باپ کی بیٹی سے پیار کرتا ہے۔ وہ اس کی سوتیلی بہن ہے لیکن باپ تو دونوں کا ایک ہے۔"

پھر وہ تضحیک آمیز لہجے میں گرجی "ایک مسلمان لڑکا اپنے خونی رشتے کو نہ پہچان سکا۔ اس کی رگوں میں بہن کی محبت کا خون کیوں نہیں دوڑا۔ کیا یہی اسلام ہے....؟ کیا اسلام یہ

"ڈیانا بیٹی تمہارا معاشرہ، کلچر، روایات و مذہبی رسومات ہم سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ پھر تم دونوں بہن بھائی کیسے بن سکتے ہو؟" قمر نے استدلالیہ انداز اختیار کیا۔

"انکل پلیز میری امنگوں کا قتل مت کیجئے۔ میری پُر بہار خوشیوں کو روندنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کی باتوں سے میرا دل گھبرا رہا ہے... میری آنکھوں کی روشنی مدھم ہو رہی ہے...." ڈیانا روہانسی ہو کر بولی "میں ہاشم کو بھائی سمجھتی ہوں.... بھائی.... بھائی۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈیانا کی ماں الزبتھ جو دروازے کی اوٹ میں کھڑی قمر اور ڈیانا کی باتیں سن رہی تھی اور قمر کو پہچان چکی تھی، بیٹی کو روتے دیکھ کر جھٹ اندر آ گئی اور طیش میں آ کر بولی۔

"قمر صاحب.... میں آپ کو بتاتی ہوں.... سب کچھ بتاتی ہوں.... تھوڑا انتظار کرو۔"

الزبتھ نے پیار سے اپنی بیٹی کو اٹھایا اور اسے اپنے بیڈ روم میں لٹا آئی۔

چند لمحات کے بعد الزبتھ سٹنگ روم میں داخل ہوئی اور زخمی شیرنی کی مانند گرجی "رذیل تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم ہمارے گھر میں آ گئے.... تم رذیل سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں مانچسٹر چھوڑ کر لندن آ گئی تاکہ آرام و سکون سے جی سکوں لیکن برسہا برس گزرنے کے بعد تم میری بہار بھری زندگی میں پھر خزاں کا بیج بونے آ گئے ہو۔"

ماں کی غصہ بھری باتیں سن کر ڈیانا چونکی اور وہ دبے قدموں کے ساتھ چل کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی اور باتیں سننے لگی۔

الزبتھ نے غصے بھرے انداز میں کہا "قمر، تم مسلمان لوگوں کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے نا۔ اب کہاں گیا تمہارا مذہب، تمہارے مذہب سے تو ہمارا عیسائی مذہب کتنا اچھا ہے.... اب تم خود ہی دیکھ لو کہ ایک عیسائی لڑکی ہاشم کو اپنا بھائی سمجھتی ہے جبکہ ہاشم اپنے باپ کی بیٹی سے پیار کرتا ہے۔ وہ اس کی سوتیلی بہن ہے لیکن باپ تو دونوں کا ایک ہے۔"

پھر وہ تضحیک آمیز لہجے میں گرجی "ایک مسلمان لڑکا اپنے خونی رشتے کو نہ پہچان سکا۔ اس کی رگوں میں بہن کی محبت کا خون کیوں نہیں دوڑا۔ کیا یہی اسلام ہے....؟ کیا اسلام یہ

پاس ہی شب بسر کروں۔ یہ ان کا ایڈریس ہے، ممی آئیں تو انہیں ایڈریس دے دینا۔ اگر وہ مجھ سے ملنے کا اشتیاق رکھتی ہوں گی تو ضرور آئیں گی۔"

"بیٹی امی کو بتائے بنا گھر سے مت جاؤ۔ تمہاری ماں کا دل کمزور ہے۔ انہیں جب تمہارے جانے کا پتا چلے گا تو ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ بہتر ہے بیٹی کہ اپنی ماں سے اجازت لے کر جانا۔ اس صورت میں تمہاری ماں صدمے سے دوچار بھی نہ ہو گی اور تمہاری وفا کی چادر پر دھبا بھی نہیں پڑے گا۔" مریم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مریم، تم بھی نری بدھو ہی ہو۔ بھلا میری ماں اس کے گھر میں جانے کی اجازت کیسے دے گی جس نے میری ماں کے بھرے گھر کو شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ اس کے گلستانِ حیات کو اجاڑ دیا۔" ڈیانا نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ بائی کر کے باہر آ گئی اور ٹیکسی کر کے اپنے باپ کے گھر چل دی۔

جب ڈیانا باپ کے گھر پہنچی تو قمر صحن کے سبزہ زار پر کرسی پہ بیٹھا تھا اور انجانے خیالوں میں گم تھا۔

ڈیانا دبے پاؤں ڈیڈی کی پشت کے پیچھے گئی اور ان کی آنکھوں کو اپنے پیالے بھرے ہاتھوں میں لے لیا۔

قمر نے اپنی آنکھوں پر نرم و ملائم انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا۔ طرب و طراوت اس کی آنکھوں سے اتر کر اس کے دل میں پہنچ گئی۔ وہ باغ باغ ہو گیا۔

وہ مسرور ہو کر بولا "آج مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرے باغ میں روٹھی ہوئی بہار آ گئی ہو.... میرے دل کی کلی کھل اٹھی ہو.... فضا مہک اٹھی ہو.... یہ پُر بہار فضائیں میری بیٹی ڈیانا کی آمد کے مدھر گیت گا رہی ہیں.... یہ میری بیٹی ڈیانا کے مخملی ہاتھ ہیں۔"

ڈیانا اپنے باپ کی شیریں گفتگو سن کر جھٹ سامنے آ گئی۔ قمر کرسی سے اٹھا اور فرطِ مسرت سے بیٹی کے گلے لگ گیا۔

اس وقت غزالہ اور ہاشم مکان کی بالکونی میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے جب ڈیانا اور قمر کے روحانی ملاپ کا منظر دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ ہاشم نے خوشی سے پھولے نہ سماتے

پاس ہی شب بسر کروں۔ یہ ان کا ایڈریس ہے، ممی آئیں تو انہیں ایڈریس دے دینا۔ اگر وہ مجھ سے ملنے کا اشتیاق رکھتی ہوں گی تو ضرور آئیں گی۔"

"بیٹی امی کو بتائے بنا گھر سے مت جاؤ۔ تمہاری ماں کا دل کمزور ہے۔ انہیں جب تمہارے جانے کا پتا چلے گا تو ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ بہتر ہے بیٹی کہ اپنی ماں سے اجازت لے کر جانا۔ اس صورت میں تمہاری ماں صدمے سے دوچار بھی نہ ہوگی اور تمہاری وفا کی چادر پر دھبا بھی نہیں پڑے گا۔" مریم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مریم، تم بھی نری بدھو ہی ہو۔ بھلا میری ماں اس کے گھر میں جانے کی اجازت کیسے دے گی جس نے میری ماں کے بھرے گھر کو شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ اس کے گلستانِ حیات کو اجاڑ دیا۔" ڈیانا نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ بائی کر کے باہر آگئی اور ٹیکسی کر کے اپنے باپ کے گھر چل دی۔

جب ڈیانا باپ کے گھر پہنچی تو قمر صحن کے سبزہ زار پر کرسی پہ بیٹھا تھا اور انجانے خیالوں میں گم تھا۔

ڈیانا دبے پاؤں ڈیڈی کی پشت کے پیچھے گئی اور ان کی آنکھوں کو اپنے پیالے بھرے ہاتھوں میں لے لیا۔

قمر نے اپنی آنکھوں پر نرم و ملائم انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا۔ طرب و طراوت اس کی آنکھوں سے اتر کر اس کے دل میں پہنچ گئی۔ وہ باغ باغ ہوگیا۔

وہ مسرور ہو کر بولا "آج مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرے باغ میں روٹھی ہوئی بہار آگئی ہو..... میرے دل کی کلی کھل اٹھی ہو..... فضا مہک اٹھی ہو..... یہ پُربہار فضائیں میری بیٹی ڈیانا کی آمد کے مدھر گیت گا رہی ہیں..... یہ میری بیٹی ڈیانا کے مخملی ہاتھ ہیں۔"

ڈیانا اپنے باپ کی شیریں گفتگو سن کر جھٹ سامنے آگئی۔ قمر کرسی سے اٹھا اور فرطِ مسرت سے بیٹی کے گلے لگ گیا۔

اس وقت غزالہ اور ہاشم مکان کی بالکونی میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے جب ڈیانا اور قمر کے روحانی ملاپ کا منظر دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ ہاشم نے خوشی سے پھولے نہ سماتے

ہوئے ماں کو اوپر اٹھالیا اور چکر لگانے لگا۔

غزالہ خوشی سے سرشار ہو کر بولی "بیٹا ہاشم، پلیز مجھے نیچے اتار دو..... اگر خدانخواستہ میں گر گئی تو میری ہڈی پسلی ایک ہوجائے گی۔"

چکر ختم کر کے ہانپتے ہوئے ہاشم بولا "ماں، آج میں بہت مسرور ہوں۔ ابو اور ڈیانا کے روح پرور ملاپ سے عندیہ ملتا ہے کہ ڈیانا شادی پر آمادہ ہوگئی ہے۔"

"ارے بدھو بیٹے، پہلے مجھے نیچے اتارو..... پھر اپنا فیصلہ سناؤں گی۔" غزالہ نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا۔

ہاشم نے ماں کو نیچے اتارا لیکن بانہوں میں پکڑے رکھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر پوچھنے لگا "اماں جانی..... اب اپنا فیصلہ صادر کریں۔"

غزالہ کے بھی انگ انگ میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ بہت فرحاں تھی۔ فرطِ مسرت سے اپنے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے وہ بولی "ارے ہٹ نکھٹو بیٹے، اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اب میری رعنا بیٹی گھر آگئی ہے۔ دیکھو تو سہی ہمارا گھر بقعۂ نور و عطر بن چکا ہے، من و ذہن مہک اٹھا ہے۔ میرا پور پور خوشیوں کے جل تھل میں ڈوب چکا ہے۔" پھر وہ خوش ہو کر بولی "آؤ بیٹا اپنے خوبرو مہمان کا استقبال کریں۔" پھر وہ بھاگتے ہوئے باہر آگئے۔

غزالہ نے بڑھ کر ڈیانا کو گلے لگالیا جب کہ ہاشم کن انکھیوں سے فرحت آمیز منظر کو دیکھ دیکھ کر ہواؤں میں اڑنے لگا۔

تب وہ چاروں خوشیوں کی آبشار میں رقص کرتے کرتے اندر آگئے۔ غزالہ ناشتہ تیار کرنے کے لئے باورچی خانے میں گھس گئی۔ قمر، ہاشم اور ڈیانا خوشی خوشی صوفے پر براجمان ہوگئے۔

ہاشم نے موقع غنیمت جان کر خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لئے کہا "ابو..... کیا ڈیانا..... کیا ڈیانا....."

ہاشم ابھی جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ قمر سردمہری سے بولا "ہاشم، تمہارے لئے اسی میں بہتری ہے کہ تم اپنی بے حجاب آرزو کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالو۔"

ابو کی تلخ گفتگو سن کر ہاشم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے حلق میں کانٹا پھنس گیا ہو۔ وہ غصے میں سرخ ہو کر بولا "یہ نہیں ہو سکتا.... یہ نہیں ہو سکتا۔"

قمر بھی بیٹے کی بات سن کر طیش میں آگیا۔ وہ نفرین برساتے ہوئے بولا "ارے نالائق.... کیا تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم ڈیانا کو بھائی کا پیار دے سکو۔"

ہاشم نے بھی زوردار آواز میں کہا "جب ڈیانا میری بہن نہیں ہے تو میں اس کا بھائی کیسے بن جاؤں۔"

ابھی وہ جملہ مکمل بھی نہ کرپایا تھا کہ قمر نے زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ اسے دن کے وقت تارے نظر آنے لگے۔ وہ چیختا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اپنا بریف کیس اٹھایا اور دوڑتے ہوئے باہر آگیا۔ ٹیکسی ہائر کی اور ائرپورٹ کی طرف چل دیا۔ جبکہ ڈیانا بھائی رکو.... بھائی رکو کہہ کہہ کر پکارتی رہی۔

ڈیانا کے لئے یہ دلخراش واقعہ غیر متوقع تھا۔ وہ اس انہونے حادثے پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ بھیگی ہوئی آنکھوں اور زخمی دل کے ساتھ ہاشم کو آواز دیتی رہی۔ "بھائی رکو.... بھائی رک جاؤ.... پلیز رک جاؤ۔" لیکن اس کی التجائیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔

غزالہ خوشی کی فضاؤں میں اڑ رہی تھی۔ موسم سہانا تھا گھنگھور گھٹا چھائی تھی۔ تیز و تند ٹھنڈی ہوا اس کے گیسوئے دراز سے کھیل رہی تھی۔ وہ کبھی اپنی لمبی زلفوں کو ہاتھوں سے سنبھالتی اور کبھی زوردار پھونک سے آنکھوں کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے ناشتہ کے لوازمات تیار کر رہی تھی۔ لیکن اس کی خوشیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔

غزالہ کو ہاشم کی چیخ سنائی دی۔ ساتھ ہی بادل بھی گرجا اور بجلی گری۔ وہ ہوائیں جو اس کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہی تھیں، اسے شعلے بن کر جھلسانے لگیں۔ اسے اپنا آشیانہ.... دل کا آشیانہ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ گھبرا کر باورچی خانے سے باہر آگئی۔ اس نے دیکھا کہ ڈیانا دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ جبکہ قمر پریشان حال سر جھکائے بیٹھا ہے۔

اس نے دل کو پکڑ کر کہا "یہ کون چیخ رہا تھا.... میرا بیٹا ہاشم کہاں ہے۔ آپ دونوں بتاتے کیوں نہیں.... میرا جگر پھٹ رہا ہے۔"

ڈیانا جو ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی، جس کا کھلیان دنیا کے ظلمی شعلوں کی نذر ہو چکا تھا، اٹھی اور غزالہ کے گلے لگ کر بولی "امی میں درحقیقت ہاشم کی بہن ہوں۔ لیکن وہ بیچارہ اس حقیقت سے ناواقف ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہی اظہار اس نے ابو سے کر دیا تو ابو نے غصے میں آکر اسے طمانچہ مار دیا۔ وہ غصے میں آگ بگولہ ہو کر گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔"

پھر وہ دست بستہ ملتجی ہوئی "امی جان، فارگاڈ سیک ہاشم کو منا کر لایئے اور اسے حقیقت بتا دیجئے، نہیں تو ہمارا خرمن جل کر راکھ ہو جائے گا۔ ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

انہونے حادثے کو سن کر غزالہ کا سر گھومنے لگا۔ دل بھی تیز تیز دھڑکنے لگا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے باہر آئی۔ کار میں بیٹھی اور کار انجانی منزل کی جانب دوڑا دی۔ شاید وہ مہتاب کے اپارٹمنٹ کی جانب جا رہی تھی کیونکہ مہتاب کے سوا اس کا کوئی اور مونس و غمخوار نہیں تھا۔

جونہی ڈیانا نے گھر چھوڑا تو بوڑھی مریم نے ڈیوٹی پر الزبتھ کو فون کیا۔

"الزبتھ اسپیکنگ۔"

"میں مریم بول رہی ہوں۔"

"ہاں مریم کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔ میں ابھی ڈیوٹی پر پہنچی ہوں کہ تم نے فون کر دیا ہے۔"

"مالکن کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔"

"ارے مریم جلدی سے بتاؤ۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔"

"وہ.... وہ ڈیانا اپنے ڈیڈی کے گھر چلی گئی ہے۔"

"کیا!" الزبتھ اس دلخراش خبر کو سن کر سکتے میں آگئی۔ اس پر غموں کے اولے گرنے لگے۔ وہ ہذیانی کیفیت میں بولنے لگی۔

"قمر خبیث نے برسہا برس پہلے میری ہنستی کھیلتی زندگی کو اجاڑ دیا تھا۔ میرے من کے ریزے ریزے کر دیئے تھے۔ لیکن میں نے ان کرچیوں کو سمیٹ کر ہمت، عزم و صبر کی مرہم پٹی کر دی۔ پھر مجھے ڈیانا کا سہارا مل گیا تو میں طمطراق سے خارزار میں چلتی رہی۔" پھر وہ

ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "اب قمر شیطان مجھ سے میرا یہ سہارا بھی چھیننا چاہتا ہے تاکہ میری ناؤ بن مانجھی کے رہ جائے۔ میرا بیڑا پار نہ لگے اور میں تڑپتے تڑپتے منجدھار میں ڈوب جاؤں۔" مریم نے الزبتھ کی ہذیانی گفتگو سنی تو اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا "ما کلن ہوش میں آیئے پلیز ہوش میں آیئے اور آگے کا سوچیے۔"

"ہاں مریم۔ میں ابھی گھر آتی ہوں اور منحوس قمر کو زندہ درگور کرنے کی حکمتِ عملی بناتی ہوں۔" الزبتھ نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

الزبتھ تیز تیز ڈگ بھرتے باہر آئی۔ اپنی کار میں بیٹھی اور فل ایکسی لیریٹر دبا دیا۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور کار ڈگمگا رہی تھی۔ اچانک سامنے سے ایک تیز رفتار کار آئی اور دونوں کاریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ دوسری کار میں غزالہ تھی جس کے ہوش و حواس بھی کھوئے ہوئے۔ دونوں کاریں فل اسپیڈ میں تھیں اس لیے جب وہ ٹکرائیں تو دونوں نے متعدد پلٹیاں کھائیں اور بری طرح اندر کو پچک گئیں۔ دونوں عورتوں کو دروازے کاٹ کر اندر سے نکالا گیا۔ وہ دونوں مرچکی تھیں۔ ان کے اجسام بری طرح مسخ ہو چکے تھے۔ بس مشکل سے لہولہان چہروں سے پہچانی جاتی تھیں.... جس نے بھی انہیں دیکھا اس کا کلیجا پھٹ گیا۔

جان گسل حادثے کی خبر پا کر ڈیانا اور قمر کی حالت غیر ہو گئی۔ قمر کو تو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اسے ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ جبکہ ڈیانا فرطِ غم میں اکثر چیختی رہتی۔ اس کی چیخیں سن کر لوگ تو کیا گھر کی دیواریں بھی لرز جاتیں۔

قمر کو ہوش آیا تو اس نے مہتاب کو فون کرایا۔ مہتاب خبر ملتے ہی الٹے پاؤں ہسپتال پہنچ گیا۔ قمر نے اسے مکمل وضاحت سے اپنی درد بھری آپ بیتی سنائی اور اسے ڈیانا کی خبر لینے کے لئے بھیج دیا۔

مہتاب پہلے تو قمر کے گھر گیا لیکن وہاں ڈیانا نہیں تھی۔ پھر وہ ڈیانا کے گھر گیا‘ اطلاعی گھنٹی بجائی تو مریم نے دروازہ کھولا۔ مہتاب نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

"ڈیانا کہاں ہے؟"

"بیٹا وہ تو مسہری پر اوندھے منہ لیٹے آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہے۔ اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ وہ اپنی ماں کے غم میں ہر وقت روتی رہتی ہے۔ اب تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہے۔ اکثر بے خیالی میں وہ چیخنے بھی لگتی ہے۔ اس کی چیخیں میرا دل بھی ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر اس کے دکھوں کی آگ میں‘ مَیں بھی جل کر مر گئی تو پھر اس بیچاری کا کیا حشر ہو گا۔ یہ تو بری موت مرے گی۔"

مہتاب نے آگے بڑھ کر مریم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جگر چاک ہو کر بولا "مریم ایسا نہ کہو مجھے بتاؤ ڈیانا کس کمرے میں ہے۔"

پھر مہتاب ڈیانا کے کمرے میں آیا۔ ڈیانا نے کھٹ کھٹ کی آواز سنی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مہتاب نے ڈیانا کو دیکھا جو سوکھ کر کانٹا بن چکی تھی تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے موتی چمکنے لگے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں ڈیانا کو دلاسا دینے لگا۔ "ڈیانا تمہاری ماں کے مرنے کا مجھے بھی اتنا ہی افسوس ہے جتنا تمہیں ہے.... میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہارا دل ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ لیکن تمہیں جینا ہے۔ اپنے الیگزینڈر کے لئے‘ اپنے ابو کے لئے۔"

"کون سا الیگزینڈر‘ کون سے ابو... وہ دونوں تو ابھی تک مجھے پوچھنے بھی نہ آئے۔"

"ارے پگلی‘ ہو سکتا ہے اس جانکاہ حادثے کی الیگزینڈر کو خبر نہ ملی ہو۔ رہا سوال تمہارے ابو کا تو وہ بیچارے تو ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں تو جونہی غزالہ اور الزبتھ کے مرنے کی خبر ملی تو وہ انتہائی خطرناک ہارٹ اٹیک کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب چار دن کے بعد انہیں کچھ ہوش آیا تو انہوں نے مجھے فون کروا کر اطلاع دی ہے اور انہوں نے ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تمہاری خیریت سے انہیں آگاہ کروں۔ وہ تمہیں دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں۔ وہ چار دن میں اتنے لاغر و نحیف ہو چکے ہیں کہ پہچانے بھی مشکل سے جاتے ہیں۔ ڈیانا حوصلہ کرو۔ ہمت کر کے اٹھو اور میرے ساتھ ہسپتال چلو‘ ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہ بچ جائیں۔ لیکن اگر تم ہسپتال نہ گئیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ چند دنوں میں اس فانی دنیا سے منہ موڑ لیں۔"

"نہیں..... نہیں میں ابو کو مرنے نہیں دوں گی۔ میں ابھی ہسپتال چلوں گی۔" وہ چیخی۔

مہتاب ڈیانا کی لرزا دینے والی چیخ سن کر کانپ اٹھا۔ لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور ڈیانا کو سمجھا بجھا کر اسپتال لے آیا۔

قمر نے اپنی بیٹی کو دیکھا تو اس کے دل کی کلی کھِل اٹھی۔ وہ چمکتی آنکھوں سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیٹی کو گلے لگالیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کے اشک بیٹی کی پیٹھ پر ٹپک رہے تھے۔ باپ کے اشکوں سے ڈیانا کے دل سے اٹھنے والے شعلے سرد ہونے لگے۔ پھر وہ بجھ گئے تو وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔

"ابو..... میں دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں..... اس کانٹوں بھری دنیا میں میرے لئے اکیلے چلنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔"

قمر نے بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹی تم تنہا نہیں ہو۔ تمہارا ابو میدانِ کارزار میں تمہارے ساتھ چلے گا۔ انشاءاللہ کامیابیاں و خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی۔"

"سچ ڈیڈی؟" ڈیانا نے ڈبڈباتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ڈیانا بیٹی میری لکی ڈاٹر۔"

بعد ازاں ڈیانا مہتاب کی طرف متوجہ ہوئی جو باپ و بیٹی کی پیار بھری باتوں کو سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"مہتاب! تھینک یو ویری مچ۔ تم نے مجھے ڈیڈی سے ملایا بھی اور ہم دونوں باپ بیٹی کو نئی زندگی سے نوازا بھی۔"

"ارے ڈیانا یہ تو میرا فرض ہے۔" مہتاب نے میٹھی مسکراہٹ سے کہا۔

ڈیانا نے چمکتی آنکھوں سے مہتاب کو ایسے دیکھا جیسے کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ مہتاب ڈیانا کی شوخ آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس نے اپنا سر جھکالیا۔

○☆○

ہاشم بغیر اطلاع دیئے گھر پہنچا تو گھر کے تمام افراد اسے دیکھ کر ہکا بکا ہو گئے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا "ہاشم تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔ ہم اپنے چاند کو اپنی کہکشاں میں خود ائرپورٹ سے لاتے۔"

"کیا بتاؤں ... میرے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی تھی۔ اس جگر چھلنی ٹریجڈی نے مجھے آپ لوگوں کو انفارم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔" ہاشم نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"بیٹا ہم بھی جانیں کہ ہمارے لعل پر کیا گزری۔" آفتاب نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ابو! اگر میں دلخراش واقعے سے حقیقت کا پردہ اٹھادوں تو آپ لوگ برداشت نہیں کر پائیں گے۔"

"بیٹا اس دنیا میں سُکھوں کے ساتھ دکھ بھی سہنے پڑتے ہیں۔ اگر زندگی کے ساتھ ساتھ غموں کا ثقیل بوجھ اٹھانا نہ پڑے تو خوشیوں کو انجوائے کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پیاسے کو پانی کی قدر ہوتی ہے۔ لہٰذا بیٹا بلا تردّد حقیقت کا پردہ چاک کر دو۔ تمہارے ابو کے سینے میں بہت بڑا دل ہے جو غموں کو سہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔" آفتاب نے ہاشم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابو.... انکل.... انکل قمر.... کم از کم میرے لئے تو گہن لگا چاند ثابت ہوئے ہیں..... میں ان سے مل کر ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ مجھے ان کی محبت پر بہت ناز تھا۔ لیکن جب ان کی محبت کو آزمانے کا وقت آیا تو وہ تنکے کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔ انہوں نے میرے من میں تاریکی بکھیر دی ہے۔ وہ واقعی گہن لگا چاند ہیں' ان کی کرنوں سے ہمارے دل کبھی بھی منور نہیں ہو سکتے..... نہ کبھی پہلے ہوئے تھے... اور نہ اب ہوں گے۔"

"لیکن بیٹا بات کیا ہے..... حقیقت جاننے سے پہلے ہم ہاں میں ہاں کیسے ملا سکتے ہیں۔" آفتاب نے متحیر ہو کر کہا۔

"تو سنئے۔" ہاشم نے زہر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں ڈیانا سے ٹوٹ کر پیار کرنے لگا.... ڈیانا بھی مجھ سے پیار کرتی ہے لیکن بقول اس کے وہ میرے ساتھ عاشقانہ پیار نہیں کرتی بلکہ حقیقی پیار کرتی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کے لئے انکل قمر کو ان کے گھر بھیجا.... وہ منہ لٹکا کر واپس آ گئے.... ہمیں سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ڈیانا نے شادی سے انکار کر دیا ہے.... بلاشبہ میرے من کے مندر میں رچی بسی دیوی ریزہ ریزہ ہو گئی اور میرے دل کے آنگن میں گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے روز علی الصباح ڈیانا ہمارے گھر آئی.... انکل قمر اور وہ گلے لگ گئے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے آنٹی غزالہ اور میرے قلب کے غنچے مسکرانے لگے۔ روٹھی ہوئی بہاریں لوٹ آئیں۔ فضائیں مہکیں، سریلے نغمے گونجنے لگے۔

"لیکن یہ خوشی کا موقع وقتی ثابت ہوا۔ جونہی ہم خوشی خوشی ڈیانا اور انکل کے پاس پہنچے تو میں نے اور آنٹی نے اپنے دل ان کیلیے فرشِ راہ کر دیے۔ تھوڑے توقف کے بعد جب میں نے انکل سے پوچھا "انکل...... کیا ڈیانا شادی کے لئے تیار ہے تو انہوں نے غصے میں آ کر مجھے زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے.... اس وقت غزالہ کہاں تھی؟" آفتاب نے مضمحل ہو کر پوچھا۔

"اس وقت آنٹی ہمارے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔" ہاشم نے کہا۔

بعد ازاں کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ چند لمحات کے بعد ہاشم زہر خند سے بولا۔

"ابو پھر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنے کمرے میں جا کر پاسپورٹ اور ضروری کاغذات لئے اور ان ملبوس کپڑوں میں ہی ائرپورٹ پہنچا۔ ائرپورٹ سے ہی ٹکٹ لیا اور دوسری فلائٹ سے آپ کے پاس پہنچ گیا۔

"اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں، میں آپ کو اپنے آنے کی اطلاع کیسے دیتا۔" ہاشم نے استدلال سے پوچھا۔

"بیٹا تمہارا کہنا بجا ہے لیکن میں اس وقت تک اپنی رائے نہیں دوں گا جب تک میں قمر سے فون پر بات نہ کر لوں۔"

آفتاب نے اسی وقت قمر کو لندن فون کیا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا تو آفتاب رنجور ہو کر بولا "شاید گھر میں کوئی نہیں ہے میں رات کو پھر اسے فون کروں گا اور عقدہ کشائی کی کوشش کروں گا۔"

آفتاب زیرِ لبی مسکراہٹ سے بولا "ہاشم کی امی تم آنکھیں پھاڑ کر کیوں دیکھ رہی ہو جلدی سے ہاشم کے کھانے وانے کا بندوبست کرو۔"

حسنہ جو ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی اور جسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ قمر اپنے بیٹے کے ساتھ بھی ایسا ناروا سلوک کر سکتا ہے، آفتاب کی آواز سن کر سٹپٹا گئی۔ وہ ہکلا کر بولی "ہیں.... ہاں..... ہیں۔"

"ہیں.... ہاں کیا کر رہی ہو.... میں کہہ رہا ہوں ہاشم کے لئے پیٹ پوجا کا بندوبست کرو۔" آفتاب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او مائی گاڈ..... یہ تو میں بھول ہی گی۔" اس نے متحیر ہو کر کہا۔ پھر ہنسیاں بکھیرتے ہوئے بولی "جاؤ بیٹا نہا کر قاسم کے کپڑے پہن لو.... قاسم کا ڈیل ڈول تم جیسا ہی ہے.... اس کے کپڑے تمہیں خوب سجیں گے۔ پھر کل ہی تمہارے لیے سلے سلائے کپڑے لے لیں گے۔"

○☆○

آفتاب نے ہاشم کی بپتا سنی تو اس کے دل کی کلی مرجھائی تو ضرور لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کا بھائی اپنے بیٹے سے بھی ناروا سلوک کر سکتا ہے۔

حقیقتِ حال جاننے کے لئے اس نے دوسرے روز.... تیسرے روز.... اور پھر روز آنہ مسلسل فون کیا..... لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ آخر کار ساتویں روز فون قمر نے اٹھایا اور نحیف آواز میں بولا "ہیلو.... قمر اسپیکنگ۔"

"قمر کے بچے.... کہاں مر گئے تھے.... مسلسل سات دن سے فون کر رہا ہوں.... کوئی اٹھا ہی نہیں رہا... بھابی غزالہ کہاں ہیں؟ اگر تم گھر میں نہیں تھے تو کم از کم وہ تو فون اٹھا سکتی تھیں۔" آفتاب نے قدرے برہمی سے کہا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو آفتاب برہم ہو کر بولا "ارے نالائق بولتے کیوں نہیں..... تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔"

"میں .....میں اجڑ گیا ہوں.....میں برباد ہو گیا ہوں۔" قمر نے روہانسا ہو کر کہا ..... اور پھر اس کی ہچکی بندھ گئی۔

بھائی کی درد بھری چیخیں سن کر آفتاب گھبرا گیا۔ اس نے رنجور ہو کر پوچھا۔

"قمر، میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے.... پلیز بولو نا.... پلیز رو مت.... میں تم سے اپنے بیٹے ہاشم سے ناروا سلوک کا ہرگز حساب نہیں لوں گا... ہرگز نہیں۔"

"میرے بھائی.... تمہاری بھابی غزالہ اور ڈیانا کی ماں الزبتھ دونوں کی کاریں ٹکرائیں.... کاریں چکنا چُور ہو گئیں.... ان کے ساتھ ہی میری قسمت بھی ریزہ ریزہ ہو گئی..... غزالہ اور الزبتھ مر گئیں۔" قمر نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی دلخراش بپتا سے پردہ اٹھایا۔

بھابی غزالہ کی موت کی خبر سنتے ہی آفتاب کے ہاتھوں سے فون چھوٹ گیا۔ وہ سر کو ہاتھوں میں لے کر رونے لگا جبکہ قمر ہیلو ہیلو.... کرتا رہا... پھر اس نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

آفتاب کے رونے کی آواز سن کر حسنہ زخمی دل کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ اس نے فون لٹکے ہوئے دیکھا تو وہ معاملے کی نزاکت بھانپ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ آفتاب نے ضرور لندن قمر بھائی کو فون کیا ہو گا... پھر تلخ کلامی ہوئی ہو گی۔ جس سے آفتاب کو ذہنی صدمہ پہنچا ہو گا۔

بحرحال وہ شتابی سے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی "سرتاج آپ کا تو پہاڑ جتنا دل ہے... میں نے اپنی پوری حیاتِ مستعار میں آپ کو ہنستے چہکتے ہی دیکھا... آپ نے بڑے بڑے دکھ جھیلے لیکن صبر و تحمل کی چادر تانے رکھی۔ لیکن آج کی گریہ زاری کو دیکھ کر میں حیران و پریشان ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ آج آپ کے دل پر کون سی قیامت ٹوٹی ہے کہ آپ رو رہے ہیں۔"

آفتاب نے بھیگی آنکھوں سے حسنہ کو دیکھا اور اسے گلے لگا لیا پھر رونے لگا۔ کچھ لمحات کے بعد اس نے غزالہ کی موت کے بارے میں حسنہ کو بتایا۔

"حسنہ.... ہائے... میری بھابی غزالہ..... دنیا سے روٹھ گئی... اسے دنیا سے منہ موڑے

ہفتہ بھر گزر چکا ہے۔"

دل کو ہلا دینے والی خبر سنتے ہی حسنہ کی آنکھوں سے بھی بھادوں کی بارش برسنے لگی۔ وہ کافی دیر گلے لگ کر روتے رہے... حتیٰ کہ قاسم و زوبیا کالج سے گھر آ گئے۔ انہوں نے اپنی امی و ابو کو دلاسا دیا۔ ہاشم بھی گھر آ گیا۔ پھر جب تینوں کو غزالہ کی وفات کا پتا چلا تو ان پر بھی غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

وقت خود دردو دکھ کا مرہم ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے غموں کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ کچھ دن بعد تفصیل جاننے کے لئے آفتاب نے بھائی کو فون کیا۔

"قمر کیسے ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے بھائی جان۔"

"قمر غزالہ کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟"

"ہاشم بیٹے نے غصے سے گھر چھوڑ دیا۔ جونہی غزالہ کچن سے باہر آئی اور اسے پتا چلا کہ ہاشم باپ سے تھپڑ کھانے کے بعد گھر چھوڑ گیا ہے تو وہ بوجھل دل سے کار میں بیٹھی۔ پھر پورچ سے نکال کر مہتاب کے اپارٹمنٹ کی طرف کار دوڑا دی۔ ہم اسے روکتے ہی رہ گئے۔

"دوسری طرف الزبتھ کو جب پتا چلا کہ ڈیانا اپنے باپ سے ملنے اس کے گھر گئی ہے تو وہ بھی غصے میں آگ بگولہ ہو کر ہمارے گھر کی طرف چل دی۔ وہ بھی غصے میں کار نہایت تیز رفتاری سے چلا رہی تھی۔ دونوں کے دل اپنے اپنے غموں سے زخمی ہو چکے تھے۔ الزبتھ کو اپنی بیٹی کے گھر چھوڑنے اور غزالہ کو اپنے بیٹے کے گھر چھوڑنے کا دکھ تھا۔ پھر وہ موڑ آیا کہ جب دونوں کی کاریں آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو گئیں۔ وہ دونوں بھی تباہ ہوئیں اور میں اور ڈیانا بھی.... تم کو یہ جان کر یقیناً دکھ ہو گا کہ ڈیانا میری حقیقی بیٹی ہے کہ جسے میں زندگی بھر کوئی سکھ نہ دے سکا۔ جب میں ہاشم کے رشتے کے سلسلے میں اس کے گھر گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میری حقیقی بیٹی۔ جس کی ماں نے میرے لچھن کے طفیل مجھے طلاق دے دی تھی... اور جسے اپنا بھائی ہی چاہنے لگا تھا... عاشقانہ طور پر۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آفتاب بھی حقیقت کھل جانے پر کفِ افسوس ملنے لگا۔ کچھ لمحات کے بعد قمر افسردہ لہجے میں بولا "بھیا میں ایسا چاند ہوں کہ جس کو برے اعمال کا گہن لگ چکا ہے۔ جس کی کرنوں سے اس کے پیاروں کے قلوب کا آنگن منور نہ ہو سکا۔ اب تم ہی دیکھو نا..... کہ ایک بھائی اپنی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس واردات کا مجرم کون ہے.... کوئی غیر نہیں.... بلکہ ایک باپ...... بیٹے کا باپ۔

"میں کتنا بدنصیب ہوں کہ ہاشم کو بھی زندگی بھر پیار نہ دے سکا اور ڈیانا کو بھی۔ ڈیانا کا نام اب میں نے جمیلہ رکھ دیا ہے۔ اب میں بقیہ زندگی اپنی بیٹی پر خوب پیار نچھاور کروں گا۔ لیکن ان غموں سے میرا کلیجہ چاک ہو چکا ہے۔ میری زندگی کے دن بہت کم ہیں۔ لہٰذا یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی بیٹی کی خوب خاطر تواضع کروں.... اس کی آرزوؤں کو تعبیر کا لبادہ پہناؤں۔"

پھر قمر عزم و حوصلے سے بھائی کو سمجھانے لگا "آفتاب بھیا۔ میں اپنی آخری زندگی میں آپ کو مزید غم نہیں دینا چاہتا..... لہٰذا آپ سے اجڑے دل سے درخواست کرتا ہوں کہ ہاشم کو یہ راز ہرگز نہ بتایئے گا کہ وہ میرا بیٹا ہے.... میں نہیں چاہتا کہ ہاشم، حسنہ، قاسم، زویا اور آپ کی خوشیوں کے چمن میں خزاں لوٹ آئے اور آپ لوگوں کے پیار میں کمی آجائے.... جب ہاشم کو پتا چلے گا تو اس کا دل مرجھا جائے گا۔ آپ لوگوں کے من کے غنچے بھی پژمردہ ہو جائیں گے۔ آپ کے پیار بھی مرجھا جائیں گے۔ لہٰذا ہاشم کو اپنا بیٹا ہی رہنے دیں۔ اس کے ساتھ میرا نام لگا کر بھرے گھر کی خوشیوں کو پامال نہ کریں۔

"آفتاب بھیا..... کیا بدنصیب بھائی کی درد بھری التجا منظور کرو گے۔" قمر نے رنجور ہو کر پوچھا۔

"ہاں بھیا..... کیوں نہیں۔"

پھر فون کٹ گیا اور آفتاب کا دل بھی غموں سے کٹ گیا۔ وہ رات بھر اپنے چھوٹے بھائی کی قسمت پر آنسو بہاتا رہا۔

صبح وہ نئے حوصلے اور عزم سے اٹھا۔ نماز خشوع و خضوع سے پڑھی۔ ناشتے کا وقت ہوا تو حسنہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آہا..... آج تو جنابِ والا چمک دمک کر ناشتے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔" حسنہ نے مسرور ہو کر کہا۔

"آج تو میں نے نماز بھی پڑھی ہے۔" آفتاب نے مسرور ہو کر جواب دیا۔

"اوہو تو آج مینہ برسے گا۔" حسنہ نے چہک کر کہا۔

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو.. ابرِ رحمت برسے.... ابرِ رحمت۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"تو اچھا آیئے ناشتے کے لئے تشریف لائیں.... بچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" حسنہ نے آفتاب کا سر مسلتے ہوئے کہا۔

"السلام علیکم۔" آفتاب نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

"واہ.... آج تو ابا جان خوشگوار موڈ میں ہیں۔" ہاشم، قاسم، زویا نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ہاں پیارے بچو..... آج میں مسرور ہوں...... کیونکہ عرصۂ دراز بعد میں نے صبح کی نماز پڑھی ہے۔ ورنہ صبح دیر گئے تک میری آنکھ ہی نہ کھلتی تھی۔" آفتاب نے زیرِلبی تبسم سے جواب دیا۔

چند لمحات کے بعد حسنہ بھی تھرماس میں چائے ڈال کر لے آئی اور آفتاب کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھر اس نے حسبِ معمول سب کو ناشتہ کرنے کا حکم صادر کیا اور سب ناشتہ کرنے میں جت گئے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد قاسم اور زویا اسکول چلے گئے۔

آفتاب نے ہاشم کو چاہت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "آؤ بیٹا سٹنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ آج تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"اوکے ابو جانی۔" ہاشم نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔

موسم برسات کی خوشگوار صبح تھی۔ رات موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ گلیوں میں جل تھل تھا۔ سڑکوں پہ بھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ آسمان پر بدلیوں کی آنکھ مچولی میں سورج چھپا ہوا تھا۔ موسم سہانا تھا۔ دریچے سے گزر کر آنے والی ٹھنڈی ہوا نے آفتاب کے ذہن و قلب

کو سرور بخش رکھا تھا۔

وہ مسرور ہو کر بولا "ہاشم بیٹا۔ آج تمہارے انکل سے فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ تمہارے گھر چھوڑنے پر تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ان کا دل ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور یہی کیفیت ڈیانا کی بھی ہے۔ اوہو ڈیانا نہیں بلکہ جمیلہ۔ تمہارے انکل نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا ہے.... پیارا نام ہے نا ہاشم؟"

"میں کیا جانوں۔" ہاشم نے بے رخی سے جواب دیا۔

"اچھا بیٹا جو کچھ ہوا اس کو بھول جاؤ۔ تمہارے انکل بہت اچھے ہیں۔ مجھے انہوں نے اپنے وزنی استدلال سے کونس کر دیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا صحیح کیا.... انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا۔" آفتاب نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ابا جانی.... وہ ضرور دل کے ہاتھوں مجبور تھے... عورت رسیا جو ہیں... گئے تھے بیٹے کی منگنی کرنے اور دل کھو آئے...... اب میرے بھوسے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ وقوعے والے روز کیوں ایک دوشیزہ سے گلے مل رہے تھے اور مجھے کیوں تھپڑ رسید کیا.... گہن لگا چاند میرے دل میں ٹھنڈی کرنوں کو منتشر کرنے کی بجائے اپنے دل میں ہی پیار کا اجالا بکھیر بیٹھا تھا۔" انجانے میں ہاشم بہت کچھ کہہ گیا۔ شاید اس کی زبان کو لگام نہ لگتی اگر آفتاب کا تڑاخدار طمانچہ اس کے گال پر نہ پڑتا۔ یہ تھپڑ بھی اسے وہیں لگا جہاں قمر کا تھپڑ لگا تھا۔

ہاشم کو دن میں بھی تارے نظر آنے لگے۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کی چیخ سن کر حسنہ بھی بھاگتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ روہانسی ہو کر بولی "بیٹا ہاشم بچوں کی طرح بلک بلک کر کیوں رو رہے ہو..... بیٹے بتاؤ... نہیں تو تمہاری ماں مر جائے گی۔"

"بیگم جانی! یہ میں بتاتا ہوں..... میں اس کے کرتوتوں پہ پڑا ہوا پردہ چاک کرتا ہوں۔" آفتاب غرایا۔ "سنو تمہارا بیٹا بے غیرت ہو چکا ہے۔ وہ اپنی حقیقی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" آفتاب نے خشمگین ہو کر کہا۔

حسنہ انہونی بات سن کر ساکت ہو گئی جبکہ ہاشم کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ گھگی بندھی آواز میں بولا "کیا جمیلہ میری سگی بہن ہے۔"

"ہاں جمیلہ تیری سگی بہن ہے اور قمر کی بیٹی۔"

"تو پھر انکل کا رشتہ میرے ساتھ کیا بنتا ہے؟" ہاشم نے مشتبہ انداز میں پوچھا۔

آفتاب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سوچ کی وادی میں غوطہ زن ہو گیا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس کے کہنے کے مطابق تو قمر ہاشم کا باپ بنتا ہے جبکہ اس نے بھائی سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے ہرگز نہیں بتائے گا کہ وہ اس کا سگا باپ ہے۔

آفتاب سوچ کی ندیا سے باہر نکلا اور پُرعزم ہو کر بولا "بیٹا قمر تمہارا انکل ہے۔ جمیلہ قمر کی بھتیجی ہے.... بھتیجی بھی بیٹی ہی ہوتی ہے۔"

پھر وہ پُریقین لہجے میں بولا "میں جمیلہ کا باپ ہوں..... تیرا باپ ہوں..... قاسم اور زویا کا باپ ہوں۔"

عقدہ کھل جانے پر ہاشم زار و زار رونے لگا۔ اس نے گریہ زاری کرتے ہوئے کہا "میں کتنا بدنصیب بھائی ہوں جو اپنی بہن سے عشق بازی کرتا رہا... مجھے موت کیوں نہ آئی.... میرے خون نے جوش کیوں نہیں مارا.... میں اپنی بہن کو پہچان کیوں نہ سکا..... میں پاپ کی گٹھڑی ہوں..... میں جمیلہ بہن کا پاپی بھائی ہوں۔ جمیلہ کتنی گریٹ بہن ہے۔ اس نے مجھے بارہا کہا کہ وہ مجھے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ جیسے بہن بھائی سے 'لیکن میں نصیبوں جلا اپنی بہن کو نہ پہچان سکا۔ ابو' اب میں سکون کی نیند نہیں سو سکوں گا جب تک میں جمیلہ بہن' آنٹی غزالہ اور انکل قمر سے اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگ لوں گا۔"

"بیٹے جانی' غزالہ کی روح تو قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔"

"نہیں بابا جانی۔ ایسا مت کہئے۔"

"بیٹا میں سچ کہہ رہا ہوں.... تم نے جب غصے میں آ کر گھر چھوڑا تو وہ تمہیں منانے کے لئے باہر نکلی' پریشانی کے عالم میں کار کو انتہائی تیزی سے دوڑا دیا.... پھر اس کی کار جمیلہ کی مما الزبتھ کی کار سے ٹکرائی.... دونوں کاروں نے متعدد پلٹیاں کھائیں اور تباہ ہو گئیں۔ ساتھ ہی الزبتھ اور غزالہ اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ گئیں۔" آفتاب نے دل مسوس کر بتایا۔

آنٹی غزالہ اور الزبتھ کی دلسوز موت کی خبر سن کر ہاشم کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ دھاڑیں

مار مار کر رونے لگا۔ "میں بدنصیب ہوں، گناہ گار ہوں اور قاتل بھی.... میں نے آنٹی غزالہ کو قتل کیا ہے.... میں نے اپنی بہن کے جذبات و احساسات کا قتل کیا ہے.... میں قاتل ہوں..... قاتل ہوں۔ مجھے مرجانا چاہئے...... مرجانا چاہئے۔"

ہاشم کی دلخراش گریہ وزاری کی آوازیں حسنہ کے کانوں میں پڑیں تو وہ سکتے کے عالم سے باہر نکل آئی۔ وہ اپنے بیٹے کو دلاسا دیتے ہوئے گویا ہوئی "بیٹا جانی مت روؤ، چپ ہو جاؤ، میرا دل بیٹھ رہا ہے، میں تمہارے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں، میں تمہاری خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم اسی طرح روتے رہے تو پھر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ میں بھی الزبتھ اور غزالہ کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"نہیں ماں، نہیں۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" ہاشم نے روتے ہوئے ماں کو سینے سے لگالیا۔ پھر ماں بیٹا دیر تک روتے رہے۔ آفتاب بھی مغموم و رنجور تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی اشکوں کا سیلاب تھا لیکن اس نے سیلاب کے گرد ہمت، استقامت و برداشت کا بند باندھ لیا۔ جب حسنہ و ہاشم رو رو کر چپ ہوگئے تو وہ حوصلہ کرکے کہنے لگا "بیٹا کل تم سے ملنے شمائلہ بیٹی آئی تھی۔ وہ تم سے ملنے کے لئے بہت بے تاب ہے۔"

"ہاں بیٹا وہ آج بھی آنے کا کہہ گئی تھی۔" حسنہ نے خندہ زیرِ لبی کہا۔

اچانک اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ حسنہ نے لپک کر دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم آنٹی جان۔"

"جگ جگ جیو بیٹی۔"

"آنٹی ہاشم کہاں ہے؟"

"بیٹی دیکھو تو سہی، وہ دور کھڑا تمہیں ہی تو دیکھ رہا ہے۔"

"او آئی سی۔"

پھر شمائلہ والہانہ انداز سے ہاشم کی طرف بڑھی جبکہ حسنہ اور آفتاب دونوں وہاں سے کھسک گئے۔ کچھ دیر ہاشم اور شمائلہ ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ شمائلہ تو ہمیشہ اپنے دل جانی کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی لیکن آج پہلی بار ہاشم کے دل میں بھی محبت نے

انگڑائی لی تو اسے شمائلہ کی آنکھوں میں محبتِ لازوال کے روشن چراغ نظر آئے جس سے اس کے دل و دماغ روشن ہوگئے۔ وہ خوشی سے سرشار ہو کر بولا۔

"ویلکم شمائلہ، ویلکم۔ یو آر گریٹ شمائلہ۔"

شمائلہ نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تھینک یو مائی ڈیر ہاشم۔ شکر ہے رب العزت کا کہ آج تمہارے دل نے میری محبت کو قبول کرلیا۔ آج میرا انگ انگ خوشیوں سے رقصاں ہے۔"

پھر وہ لڈی ڈالنے لگی... ہاشم بھی زیادہ دیر نہ دیکھ سکا.... اس نے بڑھ کر اسے اوپر اٹھالیا اور رقص کرنے لگا۔

آفتاب اور حسنہ در کی اوٹ سے رومانی منظر کو دیکھ کر مچل اٹھے اور فرطِ مسرت سے گلے لگ گئے۔ آج ان کا رواں رواں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

خوشیوں کو گلے لگانے کے بعد ہاشم اچھلتا کودتا امی و ابو کے کمرے میں آگھسا اور شادمانیوں سے سرشار ہو کر پوچھنے لگا۔

"کیا ہم کلفٹن کی سیر کو جا سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں بیٹا.... جاؤ ابھی جاؤ۔" دونوں نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا۔

پھر شمائلہ اور ہاشم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر نیچے اتر گئے اور حسنہ آفتاب خوشیوں اور چاہتوں کی ندیا میں مستغرق اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوگئے۔

○☆○

ایک کہر آلود صبح قمر نے گاڑی پورچ سے نکالی اور اپنی بیٹی جمیلہ کے گھر دوڑا دی۔ چونکہ گہری دھند چھائی ہوئی تھی اس لیے اسے کار ڈرائیو کرنے میں کافی مشکل پیش آرہی تھی۔ اللہ اللہ کرکے وہ بیٹی کے گھر پہنچ گیا۔ جمیلہ نے پاپا کو دیکھا تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ خوشیوں سے سرشار ہو کر گویا ہوئی۔

"ویلکم پاپا۔"

"لانگ لِو بے بی۔" قمر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر چاہت بھرے انداز میں بولا۔

"جمیلہ بیٹی، آج موسم سخت خراب تھا۔ دھند کے مارے گاڑی ڈرائیو کرنے میں مجھے کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔ باوجود اس کے میں اپنی بیٹی کو ملنے چلا آیا.... اس لیے کہ آج ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ایسی کون سی ضروری بات ہے ڈیڈی کہ آپ خراب موسم میں بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں بھی دنیا سے روٹھ....."

جمیلہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے قمر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ایسا نہ کہو بیٹی۔"

"ہاں تو پیارے ابو کیا بات ہے، میں بھی تو جانوں۔" جمیلہ نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"بیٹی، غزالہ اور تمہاری ماں کی موت نے مجھے اختلاجِ قلب کا مریض بنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تمہاری شادی کی مسرتوں سے اپنے من کی کھیتی کو سیراب کر لوں۔ کیا میری بیٹی میری ننھی سی آرزو کو تعبیر کا لبادہ پہنانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔"

جمیلہ شادی کی تجویز کو سن کر لجا گئی۔ اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا "ڈیڈی آپ کی خوشیوں کی خاطر تو میں اپنی زندگی جانِ آفریں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہوں..... شادی تو ایک ثانوی چیز ہے.... تکمیلِ ارشاد میں آپ کی بیٹی سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔"

"جیتی رہو بیٹی۔" قمر کا دل کھِل اٹھا۔ وہ خوشی سے مخمور ہو کر جمیلہ کو چومنے لگا۔

چند لمحات کے بعد قمر نے پیار بھرے انداز سے پوچھا "بیٹا مہتاب کیسا ہے؟"

"ابو مہتاب صاحب بہت ہی اچھے ہیں۔" جمیلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر میں اسے تمہارے لیے پرپوز کرتا ہوں۔" قمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن ابو......"

"ہاں، بولو بولو بیٹی..."

"ابو میں تو الیگزینڈر سے پیار کرتی ہوں۔"

"لیکن بیٹی وہ عیسائی ہے.... جب کہ تم اپنے باپ کی خوشنودی کی خاطر مسلمان ہو چکی ہو۔"

"لیکن اگر الیگزینڈر مسلمان ہو جائے تو پھر....."

"تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" قمر نے جمیلہ کی جبیں کو چومتے ہوئے کہا۔

"اوہ ڈیڈی ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گئی۔"

"کون سی بات بیٹی۔"

"کل ہمارے کالج کا سالانہ کانووکیشن ہے۔ مہتاب کو گولڈ میڈل ملے گا اور ہمیں سرٹیفکیٹ ملیں گے۔ مزید برآں ایک فرحت آمیز ثقافتی پروگرام پیش کیا جائے گا جس میں، میں اور الیگزینڈر بھی حصہ لے رہے ہیں..... ڈیڈی آپ ضرور آئیے گا۔" جمیلہ نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"مائی ڈیئر ڈاٹر میں کالج کانووکیشن میں ضرور شرکت کروں گا۔" قمر نے بیٹی کے ملائم رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

جب سے جمیلہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا باپ قمر ہے اور وہ پاکستان سے تعلق رکھتا ہے تو اسے بھی پاکستان سے پیار ہو گیا تھا۔ پہلے بھی اس کے چہرے سے مشرقی حسن کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ وہ دوسری لڑکیوں کے برعکس لمبا اسکرٹ پہنتی تھی جو اس کے گھٹنوں کو ڈھانپ لیتا تھا۔ وہ الیگزینڈر کے علاوہ کسی سے چنچل انداز میں بات نہیں کرتی تھی۔

لیکن اب اس کی عادات و اطوار میں یکسر تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ شلوار قمیص پہننے لگی تھی۔ بلکہ اب شلوار قمیص اس کا فیورٹ لباس بن گیا تھا۔ لہٰذا ثقافتی شو میں حصہ لینے کے لیے وہ اپنے ساتھ نسواری رنگ کی شلوار قمیص لے گئی تھی۔

جونہی میڈلز، انعامات اور سرٹیفکیٹس کی تقسیم کا کام انجام کو پہنچا تو پرنسپل نے تمام شرکائے کانووکیشن کو کالج کے آڈیٹوریم میں چلنے کو کہا۔ تمام لوگ کشاں کشاں آڈیٹوریم کی طرف چل دیے۔ پل بھر میں ہال لوگوں سے بھر گیا۔ کچھ حضرات کو کھڑا ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک ڈسکو ڈانس سے فرحت آمیز تقریب کا آغاز ہوا جسے کالج کی ذہین طالبہ صوفیہ نے پیش کیا۔ دوسرا آئیٹم ایک ٹیبلو کی صورت میں تھا جس میں لیل

و نہار کے بننے اور اس کے دیدہ زیب مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ اس ٹیبلو میں جمیلہ شلوار قمیص میں ملبوس اور اس کا بوائے فرینڈ الیگزینڈر بھی حصہ لے رہا تھا۔ جمیلہ اپنے اچھوتے لباس کے باعث لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ ٹیبلو ابھی جاری تھا کہ اچانک جمیلہ نے الیگزینڈر کا گریبان پکڑ لیا وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی ”الیگزینڈر میں تم سے شادی نہیں کروں گی.... تم عیسائی ہو جب کہ میں مسلمان ہوں۔“

حاضرین نے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ مہتاب اور قمر جو اگلی قطار میں بیٹھے انہاک سے روح پرور پروگرام دیکھ رہے تھے' ہکا بکا اور دل مسوس کر رہ گئے۔

جمیلہ کا چہرہ آگ کی مانند بھبک رہا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی۔ اچانک وہ زمین پر گر پڑی اور تڑپنے لگی۔ ایشیائی باشندوں کو تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ اس پر آسیب کا اثر ہو چکا ہو۔

مہتاب اور قمر دونوں تیزی سے اسٹیج کی طرف دوڑے۔ اسٹیج کا پردہ گرا دیا گیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ روح فرسا کھلبلی میں قمر اور مہتاب جمیلہ کو اٹھا کر باہر لائے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ مہتاب اس کے سر کو زانو پر رکھ کر دبانے لگا جبکہ قمر نے ایکسیلیریٹر دبا کر کار کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔

اسپتال پہنچتے تک جمیلہ کے ہوش و حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اس کا ضروری چیک اپ کیا گیا' بلڈ اور یورین ٹیسٹ کیا گیا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق جمیلہ مکمل طور پر فٹ تھی۔ صرف ڈپریشن کا شکار تھی اور اس ڈپریشن کی وجہ اس کی ماں کی اچانک موت تھی۔

جمیلہ بذاتِ خود اپنی انہونی بیماری پر پریشان تھی۔ دوسرے روز اس نے الیگزینڈر کو فون کیا تاکہ وہ اپنے ناروا سلوک پر اس سے معافی مانگ سکے۔

”ہیلو الیگزینڈر اسپیکنگ۔“

”ڈیئر الیگزینڈر' ہاؤ آر یو۔“

”آئی ایم آل رائٹ۔“

”پلیز فارگیو می' میں نادم و مغموم ہوں کہ کانووکیشن والے دن میں نے تم سے بہت ہی ناشائستہ سلوک کیا۔ گندی زبان استعمال کی۔ انجانے میں کیا کیا اول فول بکتی رہی۔ لیکن الیگزینڈر..... پلیز مجھے معاف کر دو۔“ جمیلہ نے نہایت انکساری سے التماس کی۔

”نہیں ڈیانا..... نہیں... میں تمہیں معاف نہیں کروں گا' تم نے بھری محفل میں مجھے جوتوں کا ہار پہنا کر اچھا نہیں کیا۔ میں تو اسی وقت تم سے بدظن ہو چکا تھا جب تم نے ڈیانا سے اپنا نام جمیلہ رکھ لیا تھا.... تم اس مذہب کی طرف قدم بڑھا رہی تھیں جس سے مجھے اتھاہ نفرت ہے.... میں تو تم سے خود اپنا دامن چھڑانا چاہتا تھا اور موقعے کے انتظار میں تھا.... میرے خدا نے یہ نادر موقع مجھے بہم پہنچا دیا ہے...... میں تم سے قطع تعلق کا اعلان کرتا ہوں.... ہاں فون منقطع کرنے سے پہلے میں تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ آج کل جینا سے میری دوستی چل رہی ہے اور جینا کا پورا جسم میری محبت کے بھنور میں پھنسا ہے۔ تمہارے لیے تو میں ایسا بھنورا تھا کہ جو پھول کا رس بھی نہ نچوڑ سکا.... لیکن جینا کے میٹھے رس سے میں فیض یاب ہو چکا ہوں..... وہ بہت ہی سویٹ گرل ہے.... اوکے بائی..... وش یو گڈ لک۔“ زہر آلود تمسخر کے ساتھ اس نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

جمیلہ کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو لیکن نہ اس نے گریہ وزاری کی اور نہ دل کو گزند پہنچائی۔ اس لیے کہ اس نے اپنے ڈیڈی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ الیگزینڈر کے ساتھ شادی اسی صورت میں کرے گی اگر وہ اسلام قبول کر لے گا۔ لیکن اس نے تو مذہب اسلام کو برائی کا نشانہ بنا کر اس کے احساسات کو مجروح کیا تھا۔ وہ اپنے مذہب کی توہین کو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے الیگزینڈر کو اپنے دل سے اس طرح نکال پھینکا جیسے مکھن سے بال کو۔

اس کے بعد اس نے ڈیڈی کو فون کیا۔

”ڈیڈی السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ میری پھول بیٹی۔“

”ابو میں نے الیگزینڈر کی محبت کو اپنے دل کی دیواروں سے کھرچ دیا..... اس لیے کہ

اس نے.... مذہبِ اسلام کی توہین کی تھی۔"

"شاباش بیٹی۔" قمر نے مسرور ہو کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم بہت ہی اچھی بیٹی ہو.... تم میری ہر بات کو قبولیت کا شرف بخش رہی ہو۔ تمہارے حسن سلوک سے میرا من بحرِ مسرت میں رقص کر رہا ہے۔ میری آنکھوں میں خوشی کے دیپ روشن ہیں اور میرے ہونٹ تمہارے پیار کے گیت گا رہے ہیں۔"

"او ڈیڈی' تھینک یو ویری مچ۔" جمیلہ نے لہک کر کہا۔

"بیٹی اِدھر مَیں خلوت نشینی کی زندگی گزار رہا ہوں اور اُدھر تم گوشہ نشین ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے پاس ہی آ کر رہنے لگو۔" قمر نے پیار سے اپنی تجویز سے جمیلہ کو آگاہ کیا۔

"ڈیڈی' آپ بالکل بجا کہتے ہیں۔ لیکن میں بھرے گھر کو کیسے چھوڑوں۔ مزید بر آں اس گھر سے میری پیاری ممی کی یادیں وابستہ ہیں.... میرا اس گھر کو چھوڑنا مشکل ہے' بہت مشکل۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

"او کے بیٹی۔ تمہاری خوشیاں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں..... لیکن کیا میں تمہاری شادی کے سلسلے میں اپنی آرزو کو تعبیر کا لبادہ پہنا سکتا ہوں۔" قمر نے مٹھاس بھری آواز میں پوچھا۔

"یس ڈیڈی۔" جمیلہ نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ' مائی ڈیئر ڈاٹر۔" قمر آنکھوں میں مسکراہٹیں سجائے بولا اور بائی بائی کر کے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

○☆○

198

آسمان پہ تیرہ ابر چھایا ہوا تھا۔ پھر سحاب زور سے گرجا۔ ساتھ ہی بجلی کا شعلہ کوندا اور ابرِ غضب برسنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد قمر کا فون بج اٹھا۔ قمر نے فون اٹھایا۔

"ہیلو قمر اسپیکنگ۔"

"ماسٹر میں مریم ہوں... غضب ہو گیا ہے۔ قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ بی بی جمیلہ نے کپڑے پھاڑ رکھے ہیں اور غضب کا واویلا کر رہی ہیں..... میں نے ڈر کے مارے بی بی کا کمرہ لاک کر دیا ہے.... پلیز جلدی آیئے۔"

"او کے مریم.... میں فی الفور پہنچ رہا ہوں۔"

قمر شتابی سے بیٹی کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت تک جمیلہ اوسان میں آ چکی تھی اور مریم اسے چائے پلا رہی تھی۔ جمیلہ باپ کو دیکھتے ہی بیڈ سے اٹھی اور باپ سے لپٹ گئی اور دیر گئے تک بابا جانی کے گلے لگی رم جھم مینہ برساتی رہی۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

"بابا جانی۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے سینے کے اندر غموں کا جھکڑ چل رہا ہے.... نہ جانے مجھے کیوں ہسٹریا کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے اپنی آہٹ سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔ تھوڑی سی ہوا چلتی ہے تو خوف کے مارے میرا برا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہوا میں معلق سایہ میری طرف بڑھ رہا ہے..... پھر وہ میرے قریب پہنچ کر میرا گلا دبوچتا ہے۔ اس کے بعد میں ہوش و حواس کھو دیتی ہوں.... پھر مجھے کیا ہوتا ہے اس کا مجھے کچھ علم نہیں ہوتا۔ لیکن جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں اپنے آپ کو نحیف و لاغر محسوس کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے کسی نے میرے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔"

"بیٹی تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ تمہارا وہم ہے' وہم۔" قمر نے اسے دلاسا دیا۔

قمر کچھ دیر بیٹی کے پاس بیٹھا رہا۔ انجانے وسوسوں میں جکڑا سوچتا رہا۔ پھر وہ بیٹی سے اجازت لے کر گھر سے باہر نکلا اور گاڑی کو مہتاب کے گھر کی جانب دوڑا دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ مہتاب کے گھر پہنچا اور اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ پل بھر میں دروازہ کھل گیا۔ مہتاب نے انکل کو اپنے سامنے دیکھا تو فرطِ مسرت سے گویا ہوا۔

"خوش آمدید انکل۔ اندر تشریف لایئے.... زہے نصیب آج ہمارے غریب خانے پر چچو جان جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ آہا۔ آج تو میرا گھر بقعۂ نور بن گیا ہے..... آج میں بہت مسرور ہوں۔ آج میرا من مجھے اچھلنے کودنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

اور پھر مہتاب اپنے آپ سے بے خبر ہو کر ناچنے لگا۔ قمر مہتاب کو محو ہو کر دیکھتا رہا۔ کچھ لمحات گزرنے کے بعد قمر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹا آج میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں.... کیا تم میری آرزو کو میرے دامن میں ڈال کر مجھے خوش ہونے کا موقع دو گے۔"

انکل کی التجا سن کر مہتاب بھونچکا رہ گیا۔ اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "انکل آپ کی کون سی تمنا ہے..... میں انشاءاللہ آپ کے سپنے کو پورا کروں گا۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد قمر نے غمگین لہجے میں کہا "مہتاب بیٹا۔ غزالہ اور الزبتھ کے مرنے کے بعد جمیلہ ڈپریشن کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے اس کے منگیتر الیگزینڈر نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ایسے میں اسے ایک غم گسار ساتھی کی ضرورت ہے۔ میری دور رس نگاہیں کہتی ہیں کہ تم میں ایک ہمدرد ساتھی کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں.... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم جمیلہ کو اپنی محبت دے کر اسے روٹھی ہوئی خوشیاں لوٹا دو۔"

قمر ملتجی ہو کر بولا "بیٹا یہ تمہارا احسان ہو گا اس انکل پر کہ جس نے زمانے کو دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میری اپنی اولاد میرے پیار کے حصول کے لیے ایڑیاں رگڑتی رہی لیکن میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر عیش و عشرت کے راستے پر گامزن رہا۔ اب مجھے ہوش آیا ہے جب کہ میرا اپنا آشیانہ آگ کی زد میں ہے۔ بیٹا میرے آشیانے کو جل کر راکھ ہونے سے بچالو.... بیٹا بچالو۔"

"لیکن انکل میں جمیلہ سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جبکہ میرا گہرا دوست ہاشم اس سے

ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔" مہتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بیٹا وہ ہاشم کا بے ہودہ خواب تھا۔ جو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکا ہے۔"

"وہ کیسے؟" مہتاب نے استعجاب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہاشم اور جمیلہ دونوں بھائی بہن ہیں۔" قمر نے ایک اہم راز سے پردہ چاک کرتے ہوئے کہا۔

"مائی گاڈ۔ ہاشم کتنا بدنصیب ہے کہ وہ اپنی بہن سے عشق کے پیچ ڈالتا رہا۔ اس کے برعکس جمیلہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اس نے ہمیشہ ہاشم کو بہن کے پیار سے چاہا اور ٹوٹ کر پیار کیا..... آفرین ہے جمیلہ اور اس کے پیار پر۔" مہتاب نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"بیٹا پودا کوئی لگاتا ہے اور اس کا پھل دوسرا کھاتا ہے۔ عین بعین میں نے برائیوں کا بیج بویا اور گناہوں کا پھل میرے بیٹے نے کھایا۔ میرے گناہوں کی سزا اسے ملی..... وہ بے قصور ہے۔ اس نے لاعلمی میں ایسا کیا..... وہ بے قصور ہے.... گناہ گار میں ہوں۔" قمر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن چچا جان کیا ہاشم جان چکا ہے کہ جمیلہ اس کی بہن ہے؟" مہتاب نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"ہاں بیٹا' اب اسے حقیقت کا پتا چل چکا ہے۔ اب وہ نادم و پشیمان ہے۔ وہ جمیلہ سے مل کر تلافی کرنا چاہتا ہے اور اس کے ماتھے پر بھائی کے پیار کا جھومر سجا کر اس کی زندگی میں دائمی خوشیوں کا چراغ روشن کرنا چاہتا ہے۔"

"تو چچو میں جمیلہ سے ضرور شادی کروں گا۔ جمیلہ تو ایک حور ہے۔ جو جنت سے اتر کر اس فانی دنیا میں آئی ہے..... وہ ایک سدا مہکتا پھول ہے۔ کون ایسا بدنصیب ہو گا جو ایک کھلتے و جھلملاتے گل سے اپنے دل کو نہیں مہکائے گا۔" مہتاب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

قمر نے مسرتوں سے لہلہا کر مہتاب کو چوم لیا۔

قمر نے فون پر آفتاب' شہباز اور دیگر اعزا و اقارب کو مہتاب اور جمیلہ کی شادی کی دعوت دی۔

لندن کی فضاؤں میں دونوں کی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ دونوں کی شادی میں آفتاب' ہاشم' قاسم' زویا' حسنہ' مہتاب کے ابو شہباز اور امی شائستہ نے شرکت کی اور اپنے دلوں میں خوشیوں کے چراغ جلائے۔

شادی کے دوسرے روز مہتاب نے کرایہ پر لیا ہوا فلیٹ چھوڑ دیا اور جمیلہ کے گھر آگیا۔ اب جب کہ وہ ایک جان دو قالب ہو چکے تھے' جمیلہ اس کی شریکِ حیات بن چکی تھی تو پھر جمیلہ کا تن من اور اس کا گھر.... سب کچھ اس کا اپنا تھا۔

کیونکہ وہ ہنی مون منانے کینیڈا جا رہے تھے اس لیے ان دونوں کے والدین' بہن اور بھائیوں نے پاکستان جانا مناسب سمجھا۔ سب بیک وقت ائرپورٹ پہنچے کیونکہ پاکستان اور کینیڈا کی فلائٹس کی روانگی میں صرف آدھے گھنٹے کا وقفہ تھا۔ سب نے ڈیپارچر لاؤنج میں خوب باتیں کیں اور ایک دوسرے کو نصیحتیں کیں۔ پھر پاکستان کے مسافروں کو جہاز میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ جمیلہ اور مہتاب نے سب سے گلے لگ کر خدا حافظ کہا سب سے آخر میں ہاشم مہتاب سے اور پھر اپنی بہن سے ملا۔ بہن کو گلے لگانے کے بعد اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بہن' پیاری بہن.... اب تمہارے بھیا کی بھی ایک پری وش سے شادی ہوگی۔ وہ جو تمہارے بھائی سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے.... پہلے تو میں سراب کے پیچھے دوڑتا رہا' اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ اور شائلہ کو نفرت کے پتھر مارتا رہا..... لیکن جب میں غلط فہمیوں و کوتاہیوں کی دلدل سے نکلا تو شائلہ میرے سیاہ من میں جگنو بن کر داخل ہوگئی اور میرے دل کے گوشے گوشے میں اجالے کی کرنیں بکھیر گئی.....اب میں بھی شائلہ کی زلفِ تابدار کا اسیر بن چکا ہوں۔ اب میں اسے اپنی زندگی کے پنجرے میں قید کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے قیدی بنانے میں مجھے کچھ دشواری پیش آئے۔ اس لیے کہ وہ کافی RIGID ہے۔ اس وقت مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہوگی... کیا تم میری مدد کرنے آؤ گی؟"

"او بھیا مجھے بھول بھلیوں میں مت دھکیلو.... سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ میں تمہاری شادی میں شرکت کروں۔ ارے نادان بھیا۔ وہ بھائی جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز

سمجھتی ہوں اور جسے میں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں' وہ سر پر شادی کا سہرا سجائے اور جمیلہ نہ آئے... جمیلہ تو پر لگا کر فضاؤں میں اڑ کر آئے گی۔" جمیلہ نے بھائی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

پھر دوبارہ بہن بھائی گلے ملے اور ہاشم گڈبائی کہتا لاؤنج سے باہر نکلا اور بس میں سوار ہو گیا۔

تھوڑی ہی دور جہاز رن وے پر کھڑا تھا۔ اس نے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے جمیلہ کو ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہا۔ جمیلہ نے بھی جو کہ گلاس کی دیوار کے ساتھ چپکی تھی' غمگین و اداس آنکھوں سے اسے دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔

○☆○

پھر وہ سہانا دن قریب آگیا جس کا گھر کے ہر فرد کو بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ وہ دن خوشیوں والا دن ہوتا ہے۔ اس روز انسان کے ننھے دل میں خوشیوں کے چراغ جگمگا اٹھتے ہیں۔ آنکھوں میں طراوت سما جاتی ہے۔ ذہن میں طمانیت اتر جاتی ہے اور ریشے ریشے میں مسرت دوڑنے لگتی ہے۔ اور وہ فرحت بخش دن خوشیوں کی مناسبت سے شادی کا دن کہلاتا ہے۔

شادی ..... کس کی شادی.... ہاشم اور شائلہ کی شادی ماہِ کامل کو ہونا طے پائی۔ وہ ۲۳ مارچ کا تاریخی دن تھا.... وہ دن جس دن کل پاکستانیوں کے دلوں میں خوشیوں کے چراغ جھلملانے لگتے ہیں۔

پاکستان میں تمام اعزا و اقارب کو شادی کے کارڈ تقسیم کر دیے گئے۔ لندن میں قمر' جمیلہ اور مہتاب کو فون اور فیکس پر دعوت دے دی گئی۔ وہ تینوں خصوصاً جمیلہ یہ مسرت آگیں خبر سن کر بہت خوش ہوئی۔ انہوں نے شادی سے ایک ہفتہ قبل پاکستان پہنچنے کا پروگرام بنایا اور اس کی اطلاع آفتاب کو دے دی۔

۱۶ مارچ کی رات بڑی سہانی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ایسے سہانے موسم میں

آفتاب، ہاشم، قاسم و زویا ارائیول لاؤنج میں انتظار کی گھڑیاں خوشی سے گن رہے تھے۔ ان کے چہرے دمک رہے تھے۔ صرف حسنہ ائرپورٹ نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے پیاروں کے لیے کھانے وانے کا انتظام کر رہی تھی۔

اللہ اللہ کر کے لندن کی فلائٹ پہنچی۔ سب کے چہروں پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔

تب مسافر ارائیول لاؤنج میں پہنچنے لگے.....

آفتاب نے برسہا برس گزرنے کے بعد اپنے بھائی کو پاکستان کی سرزمین پر دیکھا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جلدی سے بھائی کی جانب لپکا اور اسے گلے لگا لیا۔

بڑا ہی دیدنی منظر تھا۔ جمیلہ پاکستان کی پاک زمین پر قدم رکھ کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اسے باپ کی مادرِ گیتی کو دیکھنے کا بڑا ہی اشتیاق تھا۔ آج اس کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ وہ فرطِ مسرت سے قمر، قاسم، زویا اور ہاشم سے گلے لگ کر مل رہی تھی۔

ہاشم سے ملنے کے بعد جمیلہ نے منہ لٹکا کر پوچھا "ویئر از مائی آنٹی؟"

"یور آنٹی از ان ہاسپٹل۔" ہاشم نے زیرِلبی تبسم سے کہا۔

"کیا... کیا؟" جمیلہ نے رنجور ہو کر کہا۔

"اری ناداں بہنیا۔ پریشان نہ ہو... اس وقت تمہاری آنٹی ہاسپٹل آف فوڈیلنی کچن میں ہے اور آپ لوگوں کے لیے طرح طرح کے کھانوں کی ڈشیں تیار کر رہی ہیں۔" اس نے جمیلہ کے گلابی رخسار پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"او مائی گاڈ۔ تم کتنے شرارتی ہو۔" جمیلہ نے اس کے کان مروڑتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب خوشیوں کو گلے لگائے گھر پہنچے۔ قمر، جمیلہ اور آفتاب فرداً فرداً حسنہ سے ملے اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

کھانا کھاتے ہوئے قمر نے کہا "آفتاب بھیا، آپ ارائیول لاؤنج میں کیسے پہنچ گئے؟"

"ارے قمر تم کیا بے تکی بات کر رہے ہو۔ تمہارا بھائی کسٹم آفیسر ہے للّو پنجو نہیں ہے۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"او ہو میں یہ تو بھول ہی گیا تھا۔" قمر نے کہا۔

"میں شائلہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اسے دیکھے بغیر نیند نہیں آئے گی۔ مجھے اس کے گھر لے چلو۔"

"ارے قمر لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ ابھی رات کے دو بجے ہیں۔ وہ سب خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے..... کل صبح ۹ بجے مہتاب کے ابو اور امی قطر سے ڈیپوٹیشن کی میعاد پوری کر کے آ رہے ہیں۔ ہم سب انہیں ائرپورٹ لینے جائیں گے اور واپسی پر شائلہ کے گھر جا کر تمہاری خواہش پوری کر دیں گے۔"

"نہ بھیا نہ۔ میں دیر گئے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے تم ائرپورٹ جاتے وقت چھوڑتے جانا اور واپسی میں پک کر لینا۔"

"اوکے منظور.... اب برائے مہربانی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔" آفتاب نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

حسنہ خوشی کے مارے صرف گھنٹہ بھر سوئی ہو گی کہ اس کے کانوں میں اذان کی رس بھری آواز پڑی تو حسبِ معمول وہ اٹھی۔ وضو کیا اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ ناشتہ بنانے میں لگ گئی۔ ناشتہ بناتے بناتے آٹھ بج گئے۔ وہ فکرمند ہو کر ماسٹر بیڈ روم میں گئی اور آفتاب کا کندھا ہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ہاشم کے ابو جلدی سے اٹھو۔ دیر ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ائرپورٹ پہنچنے میں دیر ہو جائے۔" آفتاب فوراً اٹھ بیٹھا۔ وہ آنکھیں ملتے ملتے پوچھنے لگا۔ "بیگم جانی! کیا وقت ہوا ہے؟"

"صبح کے آٹھ بج گئے ہیں۔"

"افوہ، بہت دیر ہو گئی ہے......" پھر وہ اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

بعد میں حسنہ نے ہلکے سے قمر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر اندر گھس گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھی کہ قمر بھی اپنے بھائی کی طرح خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے اسے بھی اٹھایا۔

اس کے بعد حسنہ نے باری باری ہاشم، قاسم، زویا کو جگایا اور آخر میں وہ مہتاب اور جمیلہ کے کمرے میں گئی۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تو بن ٹھن کے بیٹھے تھے۔ اس

نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"میرے دل کے غنچو.... کیا تم آج رات سوئے نہیں۔"

آنٹی ہم دونوں کو خوشی کے مارے نیند ہی نہیں آئی۔ ہم رات بھر باتیں کرتے رہے.... اس کے علاوہ ہماری آنکھیں ابو اور امی کے انتظار میں لگی ہوئی ہیں.... آپ تو جانتی ہیں کہ کسی کا انتظار ہو اور نہلے پہ دہلا کہ پہلے ہی انسان خوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہا ہو تو پھر نیند اڑ جاتی ہے۔" مہتاب نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔

سب جلدی جلدی تیار ہوئے لیکن کوئی بھی ناشتہ نہ کرسکا۔ کیونکہ ناشتے کا وقت ہی نہیں بچا تھا۔ ان سب کے تیار ہونے میں پونے نو بج چکے تھے اور فلائٹ کے آنے کا وقت نو بجے تھا۔ مہتاب' جمیلہ' حسنہ' ہاشم گاڑی میں بیٹھے اور حسنہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ قمر' آفتاب' قاسم اور زویا نے ٹیکسی ہائر کی اور ائرپورٹ کی طرف چل دیے۔ راستے میں نرسری میں شمائلہ کے گھر کے سامنے آفتاب نے قمر کو ٹیکسی سے اترنے کو کہا اور خدا حافظ کہہ کر ائرپورٹ کی طرف چل دیے۔ قمر نے انجانے خیالوں میں ڈوب کر گھنٹی بجائی۔ شمائلہ کے ابو تو دس بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہ تھے۔

ایک زلیخا ہی تھی جو علی الصباح اٹھتی' اللہ کی بارگاہ میں حاضری دیتی اور قرآن شریف پڑھتی۔ اس وقت وہ کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ کچن سے باہر نکل کر بیڈ روم میں آئی۔ اپنا دوپٹہ لیا اور اسے سر پر اوڑھ کر مین ڈور کی طرف بڑھی اور کنڈی کھول دی۔

وہ اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر سٹپٹا گئی...وہ اسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ برسوں پہلے کا کربناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا کہ ایک گھناؤنی شب وہ نیم برہنہ کھاٹ پر لیٹی تھی کہ ایک بے حمیت شخص نے اس کی متاعِ عزیز لوٹ لی تھی۔ وہ برباد ہوگئی تھی..... اس کی حسین زندگی نیست و نابود ہوگئی تھی۔

اس مکروہ یاد کے آتے ہی وہ بھڑک اٹھی۔ وہ شعلہ بن کر لپکی۔ وہ شعلے برساتے ہوئی گرجی "رذیل.... تم.... تم.... یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی.... تم

ننگِ دین ہو.... تم ایک ایسا ناسور ہو کہ جس نے کئی معصوم عورتوں کو زخمی کیا ہے.... عورتیں تنکا تنکا اکٹھا کر کے آشیانہ بناتی ہیں۔ ان کا گھر تو گھونسلا ہوتا ہے اور تم جیسے پنج مردان گھونسلوں کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں..... تم مرد لٹیرے ہو.... معصوم عورتوں کو لوٹ کر انہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہو اور انہیں نہ جینے دیتے ہو نہ مرنے دیتے ہو۔"

پھر زلیخا نے تھوکتے ہوئے کہا "تھو..... تھو تم پہ...دفع ہو جاؤ یہاں سے' دفع ہو جاؤ۔"

پھر اس نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔

قمر زلیخا کے برسائے ہوئے شعلوں سے بری طرح جھلس چکا تھا۔ اس کا دل بری طرح جل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دماغ ماؤف ہوتا وہ ہمت کر کے بول اٹھا۔

"زلیخا' میں ہاشم کا انکل ہوں۔"

ہاشم کا نام سن کر زلیخا نے دروازہ کھول دیا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

قمر کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ دل کو دباتے ہوئے بولا "زلیخا میں تمہارا مجرم ہوں.... میں الزبتھ' مارگریٹ اور میری کا مجرم تھا...میں کیفرِ کردار تک پہلے ہی پہنچ چکا ہوں..... میں چراغِ سحری ہوں..... میری زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ جب کہ تمہاری زندگی کا چراغ جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ اس کی کرنوں سے ہاشم اور شمائلہ کے آنگنِ حیات کو روشن ہونا ہے۔ میری آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے ان کی زندگی میں کانٹوں کا بیج نہ بوؤں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اس دنیا سے دور.... بہت دور چلا جاؤں.... اور تم مجھے ہاشم اور شمائلہ کی خوشیوں کی خاطر عفو و درگزر کا کفن پہنادو.....اور اپنا راز ہمیشہ کے لیے اپنے کھلے سینہ افگار میں چھپا کر چھاتی کو سی لو۔"

معاً قمر دھڑام سے گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔

زلیخا بدحواس ہو کر سٹنگ روم میں بھاگی۔ سب سے پہلے ایدھی سینٹر کو ایمبولینس کے لیے فون کیا اور پھر مظفر کو جگا کر کہا۔

"شمائلہ کے ابو' ظلم ہوگیا۔ ہاشم کے انکل ملنے کے لیے آئے تھے۔ جونہی میں نے

دروازہ کھولا تو وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے کہ میں قمر ہوں.... ہاشم کا انکل..... اور پھر وہ گر پڑے۔“

درایں اثنا شائلہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ پھر وہ تینوں صدر دروازے کی طرف لپکے جہاں قمر گرا موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ شائلہ نے قمر کے پاؤں کے تلوں کو ملنا شروع کر دیا اور مظفر نے زور زور سے اس کے سینے کو دبانا شروع کر دیا جبکہ زلیخا دروازہ کھولے ایمبولنس کا انتظار کر رہی تھی۔

عبدالستار ایدھی پاکستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہے۔ اس عظیم شخص نے اپنی زوجہ کے ساتھ مل کر ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور زبان ان دونوں عظیم شخصیات کے گن گاتی ہے۔

یہ ان کی سعیِ حسنہ کا نتیجہ ہے کہ اب پاکستان کے گوشے گوشے میں ایدھی سینٹر اور شفاخانے قائم ہیں جہاں ناداروں، مسکینوں، نشہ بازوں، اپاہجوں، نفرین و ستم زدہ عورتوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ان کے لیے رہائش کا معقول انتظام ہے۔ علم و ہنر سے آراستہ کر کے انہیں اچھا شہری بنانے کی سعی کی جاتی ہے۔

مریضوں اور سڑکوں پر حادثے کا شکار ہونے والے زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا جاتا ہے۔ جس کے لیے ایمبولینس کا ماڈرن انتظام ہے۔ حادثے کی وہ جگہ جہاں ایمبولینس کا پہنچنا دشوار ہو تو وہاں ہیلی کاپٹر استعمال کیا جاتا ہے۔

قصہ مختصر یہ عبدالستار ایدھی اور ان کی زوجہ محترمہ بلقیس بیگم کا پاکستانیوں پر ایک احسانِ عظیم ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کے کارہائے نمایاں کی وقعت و قیمت تو اُن ان گنت اشخاص سے پوچھیں جنہوں نے ان کی خدماتِ جمیلہ سے استفادہ و استفاضہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے ان دونوں عظیم ہستیوں کو اپنے دلوں میں بسا رکھا ہے۔ وہ دن رات ان کی درازیِ عمر و اچھی صحت کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔

ایدھی سروس سے فائدہ اٹھانے کے لیے زلیخا نے ایدھی سینٹر فون کیا تھا اور زلیخا کی توقع کے عین مطابق پندرہ منٹ کے اندر ایمبولینس پہنچ گئی۔ قمر کو اٹھا کر ایمبولنس میں ڈالا گیا اور

ایمبولینس کی روانگی سے پہلے مظفر نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹی تمہاری امی اور میں سول ہسپتال جا رہے ہیں۔ تم گھر میں ہی رہو... آفتاب بمعہ فیملی ائرپورٹ گئے ہیں۔ واپسی میں وہ یہاں سے ہو کر جائیں گے لہٰذا تم ان کو واقعے کی نوعیت بتا دینا.... ٹھیک ہے نا بیٹی۔“

”ٹھیک ہے ابو۔“ شائلہ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

قمر کو انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ فی الفور اسے آکسیجن اور ڈرپ لگا دی گئی۔ اس کی جان بچانے کے لیے ہر تدبیر اور طریقہ استعمال کیا جانے لگا۔ اس دوران آفتاب، شہباز، مہتاب و دیگر لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہسپتال پہنچ گئے اور کوریڈور میں بیٹھ کر رب العزت کی بارگاہ میں قمر کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔

قمر کو ہوش آ گیا لیکن ڈاکٹر نے کسی کو ملنے کی اجازت نہ دی۔ سب گھر والوں پر غموں کی اوس پڑ چکی تھی لیکن جمیلہ کا بہت برا حال تھا۔ وہ رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کے حکم کی تکمیل میں سب افسردہ دلوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ صرف جمیلہ اور اس کے شوہر مہتاب کو ہسپتال میں رکنے کی اجازت دی گئی۔

رات کے پچھلے پہر قمر کو ذرا سا ہوش آیا۔ مریض کی درخواست پر جمیلہ اور مہتاب کو اندر بلایا گیا۔

قمر نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سرگوشی کی ”بیٹی میں نے لندن کی تمام جائداد پہلے ہی تمہارے نام لکھوا دی ہے۔ کاغذات سیف میں پڑے ہیں.... کوشش.... کرنا.... کاروبار کو سنبھالنے اور وسعت دینے...... کی۔“

معاً قمر کی زبان بند ہو گئی اور اس کا سر ڈھلک گیا۔

جمیلہ اپنے باپ کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ وہ زور سے چلّانے لگی ”نہیں ڈیڈی نہیں، تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے.... میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

پھر وہ ڈیڈی کو زور زور سے جھنجوڑنے لگی۔ اب اس پر اپنی بیماری کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ چیختے چیختے گر پڑی اور اس کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے...... ڈاکٹر و نرس دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے اور انہوں نے اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔

مہتاب نے آفتاب انکل کو قمر کے مرجانے اور صدمے کے مارے جمیلہ کی بیماری کی اطلاع بذریعہ فون ہچکچاتے ہوئے دی "انکل...... قمر ہمارا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں اور جمیلہ ان کے غم میں بری طرح تڑپ رہی ہے....."

اچانک فون اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ تیزی سے واپس کمرے میں آیا تو اسے پتا چلا کہ جمیلہ کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر دوسرے وارڈ میں سلا دیا گیا ہے۔

پلک جھپکنے میں آفتاب' شہباز اور گھر کے تمام افراد ہسپتال پہنچ گئے۔ وہ غموں سے نڈھال تھے۔ وہ اپنے اوپر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر سخت مغموم و رنجور تھے..... ہاشم تو ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

اسی دن قمر کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پھر سب جمیلہ کی دلجوئی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

سوئم کے روز جمیلہ کو بھی ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ بالکل تندرست تھی۔ اس کے ایکسرے اور ای سی جی وغیرہ سب نارمل تھے۔ ڈاکٹر نے مہتاب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو مشہور ماہرِ اعصاب ڈاکٹر عزیز کو دکھائے۔

ایک روز باتوں ہی باتوں میں شہباز نے آفتاب کو تجویز پیش کی۔

مہتاب کے کہنے کے مطابق جمیلہ کو اکثر آسیبی دورے پڑتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر جن بھوت کا اثر ہے.... میرا ذاتی خیال ہے کہ جمیلہ کا چیک اَپ کسی نیورو سرجن سے کرایا جائے..... مجھے اس کی دماغی حالت میں خلل کا شک پڑتا ہے...."

ابھی شہباز بات کر ہی رہا تھا کہ مہتاب جھٹ بولا "ہاں ابو' مجھے ہارٹ اسپیشلسٹ نے جمیلہ کو ڈسچارج کرتے وقت مشورہ دیا تھا کہ جمیلہ کو کسی ماہرِ اعصاب کو دکھاؤ.... جمیلہ اس کے علاج سے ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔"

اسی لمحے زویا بھی جھجکتے جھجکتے گویا ہوئی "ہاں ابو.... آج میرا کلاس فیلو نجیب میڈیکل

فرسٹ ائر بتا رہا تھا کہ اس کے ابو نیورو سرجن ہیں۔ شاید ان کا نام عزیز ہے۔ ان کا کلینک رمپا پلازا میں ہے۔

"پھر تو ہم آج ہی جمیلہ کو دکھائیں گے۔" آفتاب نے پُر امید ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تو شہباز نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آفتاب بھائی میرا خیال ہے کہ میں ڈیوٹی کے لیے ائرفورس ہیڈ کوارٹر پشاور میں رپورٹ کر ہی دوں.... کیا خیال ہے تمہارا۔"

"بھائی یہ ڈیوٹی کا معاملہ ہے۔ میں اس معاملے میں ہرگز اپنی ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔ بلکہ میرا بھی تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم ڈیوٹی فوراً جوائن کر لو۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اور مہتاب کی امی آج شام کی فلائٹ سے چلے جاتے ہیں.... جمیلہ اور مہتاب تمہارے پاس اس وقت تک رہیں گے جب تک ہاشم اور شمائلہ کی شادی نہیں ہو جاتی .... اس دوران جمیلہ کا علاج معالجہ بھی ہو جائے گا۔ ہاشم کی شادی کا تذکرہ چل نکلا تو اس کے لیے بھی تمہیں صلاح دیتا ہوں کہ شادی قمر کے چہلم تک ملتوی کر کے سب اعزاو اقارب کو مطلع کر دو۔"

"لیکن کون سی تاریخ رکھی جائے؟"

"میرے خیال میں یکم مئی کی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ مزدوروں کا دن ہے۔ مزدوروں کی دعائیں رنگ لائیں گی اور شادی بابرکت و سعادت ہو گی۔"

"ٹھیک ہے شہباز بھائی۔"

پھر اسی شام شہباز اپنی بیوی کو لے کر پشاور چلا گیا۔

○☆○

دوسرے روز چار بجے شام آفتاب' مہتاب اور جمیلہ ڈاکٹر عزیز کے کلینک رمپا پلازا گئے اور پرچی لے کر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ ان کی پرچی کا نمبر گیارہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انتظار گاہ مریض[illegible]سے بھر گئی۔ تقریباً ۶ بجے جمیلہ کا نام پکارا گیا۔ آفتاب جمیلہ کو لے کر ڈاکٹر کے کمرے [illegible] ڈاکٹر کو دیکھتے ہی وہ پتھر کا تراشہ ہوا بت بن گیا۔ وہ پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتا

رہا۔ وہ پہچان گیا کہ ڈاکٹر اس کے بچپن کا دوست عزیز ہے۔

جمیلہ تو ڈاکٹر کو سلام کر کے کرسی پر براجمان ہوگئی تھی۔ لیکن وہ انکل کو دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی جو مسلسل ڈاکٹر کو تکے جا رہا تھا۔ پھر اس کی بدحواسی میں اضافہ ہوگیا۔ جب ڈاکٹر نے فائل کو پڑھنے کے بعد اوپر دیکھا۔ اس نے موٹے شیشے والی عینک کو بائیں ہاتھ سے نیچے سرکاتے ہوئے آفتاب کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔

جمیلہ دونوں کے ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھنے پر گھبرائی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ممکن تھا کہ اس پر دورہ پڑ جاتا لیکن اس سے پہلے ہی ڈاکٹر عزیز کرسی سے اٹھا اور آفتاب میرے یار..... کہہ کر اس کے گلے لگ گیا۔ دونوں جگری یار مل کر بہت خوش ہوئے۔

تھوڑی دیر پہلے جمیلہ کا دل جو خوف کا شکار تھا' خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ ان کی باتیں سن سن کر خوشی سے لٹو ہو رہی تھی۔

عزیز فرطِ مسرت سے کہہ رہا تھا "یار آفتاب برسوں بعد ملاقات ہوئی.... دیکھو تمہارا لگایا ہوا پودا اب تناور درخت بن چکا ہے۔ جس کی چھاؤں سے لاکھوں انسان فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اگر تم اسکول کے زمانے میں میری مالی مدد نہ کرتے تو...."

آفتاب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مسرور کن لہجے میں بولا "میرے یار مجھے پرانی باتوں کا طعنہ دے کر میری خوشیوں کو چھیننے کی کوشش مت کرو۔"

"اوکے آفتاب۔ اوکے۔ لیکن یہ بتاؤ کس لیے آئے ہو؟"

"بھائی یہ تمہاری بھتیجی ہے نا۔ یہ مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے.... کتنی اچھی میری بیٹی ہے بھاگوان بیٹی ہے کہ جس نے دو بچھڑے ہوئے دوستوں کو عرصۂ دراز کے بعد ملا دیا ہے۔"

آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

پھر اس نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تمہاری بھتیجی ہے نا۔ اس کو کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس پر جن بھوت کا سایہ ہو۔"

"اوہو.... تو یہ میری بھتیجی ہے.... یعنی تمہاری بیٹی.... میری بیٹی کتنی خوبصورت ہے..... اللہ نظرِ بد سے بچائے۔" پھر عزیز نے بڑھ کر جمیلہ کی پیشانی کو چوم لیا اور چاہت بھرے انداز

"بیٹی کل تم سول ہسپتال آنا۔ میں وہاں تمہارا ضروری چیک اپ اور برین اسکیننگ کروں گا.... ٹھیک ہے نا بیٹی۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" جمیلہ نے خوش کن لہجے میں کہا۔

"اور ہاں بیٹی میں آج ہی کلینک کا ٹائم ختم ہونے پر گھر جاؤں گا اور وہاں سے تمہاری آنٹی اور بچوں کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا اور پھر ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ اوکے بیٹی۔"

"اوکے چچا جان۔"

پھر آفتاب اور جمیلہ خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔ انہوں نے اپنی انہونی کہانی گھر والوں کو سنائی تو ان سب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ سب فرطِ مسرت سے دیدہ و دل فرش راہ کر کے ڈاکٹر عزیز اور ان کی فیملی کی تشریف آوری کا انتظار کرنے لگے۔

رات کے ٹھیک گیارہ بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ آج اس گھنٹی نے جو کئی سالوں سے صدر دروازے کی دیوار پر لگی تھی' آفتاب اور تمام گھر والوں کے کانوں میں امرت کا رس گھول دیا تھا۔ ان کے دلوں کی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں' وہ خوشی کے نغمے گا رہے تھے۔ وہ سب پہلے سے تیار منصوبے کے مطابق دروازے کی طرف بڑھے۔ آفتاب نے دروازہ کھولا اور سب افراد ایک دوسرے کے ساتھ والہانہ انداز سے ملے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ ایک بڑے ہوٹل گئے اور وہیں ڈنر کیا۔ آپس میں گھل مل کر باتیں کیں اور ہوٹل کے میوزک پروگرام سے انجوائے کیا۔

زویا اپنے کلاس فیلو نجیب سے والدین کی موجودگی میں مل کر بہت خوش تھی۔ وہ دونوں شاداں و فرحاں تھے کہ ان دونوں کے ابو جگری یار تھے۔ اس رات انہوں نے اپنے کردار و عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ آپس میں گہری محبت رکھتے ہیں۔ آفتاب اور عزیز یہ جان کر کہ ان کے جگر پارے ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں' خوشیوں کی ندیا میں پور پور تک ڈوب چکے تھے۔ یہی حال گھر کے تمام دوسرے افراد کا تھا۔ قصہ مختصر وہ رات ان دونوں خاندانوں کے لیے خوشیوں کی رات تھی۔ اس پُربہار رات ان سب نے دونوں ہاتھوں سے خوشیوں کو

لوٹا۔

ڈاکٹر عزیز نے جمیلہ کا مکمل چیک اپ کیا۔ سر کے ایکسرے اور برین اسکیننگ سے پتا چلا کہ جمیلہ کے دماغ میں ایک چھوٹی سی رسولی تھی۔

ڈاکٹر عزیز کو مرض کا پتا چل گیا تھا' اب اس کے لیے علاج کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ویسے بھی اللہ نے اس کے ہاتھوں کو بڑی شفا بخشی تھی۔ اس نے جمیلہ کا کامیاب آپریشن کیا۔ جمیلہ چند دنوں میں رُوبہ صحت ہو کر گھر آگئی۔ اپنے انکل کے خوبصورت گھر میں۔ وہ انتہائی مسرور تھی۔ آفتاب' مہتاب' ہاشم' قاسم و زویا کے چہروں پر بھی خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ وہ سب خوشیوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

چند دنوں کے بعد ہاشم اور شمائلہ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شمائلہ کو پھر سے مائیوں بٹھادیا گیا۔ پھر مہندی کی رسومات ہوئیں اور وہ دن آگیا جس دن جمیلہ اور زویا کا ویر گھوڑی چڑھیا..... یہ رسم ان دنوں اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن آفتاب نے چند منٹوں کے لیے اس رسم کو بھی ادا کیا اور بعد میں ہاشم کو پھولوں سے سجی ولدی ہوئی کار میں بٹھادیا گیا۔ ڈرائیور کی سیٹ قاسم نے سنبھالی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آفتاب صاحب بیٹھے اور پچھلی نشست پر درمیان میں دولہا' دائیں طرف حسنہ اور بائیں طرف جمیلہ بیٹھی تھیں۔

پھر رنگ برنگی کاروں کا قافلہ' دھیرے دھیرے چلتا چلتا مظفر ولا پہنچا۔ مظفر ولا کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے خوب سجایا گیا تھا۔ گھر کے وسیع و خوبصورت سبزہ زار پر باراتیوں کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی پھولوں کی کیاریاں دیدہ زیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ قسم قسم کی پھولوں کی ڈالیاں' لہرا لہرا کر جنت کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ چہار سو مہک و نور بکھرا تھا۔

چمکتے' مہکتے و کھلتے ماحول میں ہاشم و شمائلہ کا نکاح ہوا۔ اس کے بعد تمام باراتیوں کو متصل شادی ہال میں جانے اور کھانا تناول کرنے کے لیے کہا گیا۔

رات کے دو بجے عروس شمائلہ اپنے نئے گھر میں پہنچی جسے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ جمیلہ نے سہارا دے کر بنّو رانی کو کار سے باہر نکالا اور جھکی ہوئی ڈالی کو سہارا دے قرآن کے

سائے تلے اس آراستہ کمرے میں لے آئی جس کی تزئین و آرائش پر اس نے بہت محنت کی تھی۔ اس نے دلہن رانی کو پھولوں کی لڑیوں سے سجی ہوئی مسہری پر بٹھایا اور اس کے گلابی گال کی چٹکی لی اور خدا حافظ کہہ کر باہر آگئی... پھر جمیلہ نے چپکے سے جاکر ہاشم کو پکڑا جو ابو امی کے پاس بیٹھا چائے نوش کر رہا تھا۔ اس نے ہنسیاں بکھیرتے ہوئے کہا" بھیا ذرا میری بات تو سنو۔"

"کیا بات ہے؟"

"ادھر تو آؤ۔"

پھر اس نے ہاشم کو دلہن کے کمرے میں دھکیل کر کمرہ باہر سے لاک کردیا اور خود باہر زور سے ہنسنے لگی۔

ہاشم لرزتے بدن اور دھڑکتے دل کے ساتھ جنت سے اتری ہوئی حور کی طرف بڑھا جو گٹھری بنی مسہری پر بیٹھی تھی۔ اس نے چپکے سے گٹھری کو اٹھایا... اسے اپنی بانہوں میں لیا۔ پھر اس کی گرہ کو کھولا تو اندر سے ناپید الماس نکلا۔ اس کی منور کرنوں سے اس کا من جگمگا اٹھا۔ اس کے دل کے گوشے میں سچی خوشیاں ناچنے لگیں... اسے وہ خوشیاں نصیب ہوئیں جو پہلے اسے کبھی نہیں ملی تھیں.... وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا۔ نایاب خوشیاں ملیں تو شمائلہ اور ہاشم جھوم اٹھے.... دل کو طمانیت اور دماغ کو طراوت ملی تو ان کی آنکھوں میں نیند ناچنے لگی... تب پل بھر میں وہ سو گئے....

جمیلہ نہایت ہی خوش اخلاق' خوش شمیلہ' خوش گفتار' خوش پوشاک' خوش مزاج لڑکی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ مسلمان ہے تو وہ مسلمان ہوگئی۔ اس نے مختصر سے عرصہ میں اپنے ڈیڈی کی مادری زبان سیکھ لی۔ اب وہ پانچ وقت نہ سہی لیکن دو تین وقت کی نماز بھی پڑھ لیتی۔

بھائی کی شادی پر وہ بہت مسرور تھی۔ وہ سونے کے بجائے رات کو تہجد پڑھتی رہی۔ صبح کی اذان ہوئی تو صبح کی نماز پڑھی۔ بھائی اور بھابی کی لمبی زندگی اور اچھی صحت کے لیے دعائیں مانگیں پھر وہ گھر کے سبزہ زار میں آگئی اور چہل قدمی کرنے لگی۔

وہ دیر تک ٹہلتی رہی اور چاند بھیا اور اس کی چاندنی کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وقت بھی کچھوے کی چال چل رہا تھا۔ آخر گھڑی نے دس بجائے تو وہ چائے لے کر کشاں کشاں عروس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

"یس" اندر سے ہاشم کی آواز آئی۔

"ڈیئر برادر۔ مے آئی کم اِن؟" جمیلہ نے چہک کر کہا۔

"وائی ناٹ۔"

جمیلہ نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا تو اس نے دیکھا کا اس کا بھائی بن ٹھن کر ناول پڑھ رہا تھا اور خوبرو شمائلہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ڈرائر سے اپنی زلفِ عنبرین کو خشک کر رہی تھی۔ وہ ہنسیاں بکھیرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پیار سے جمیلہ کے گلابی رخسار پر بوسہ دیا اور متبسم ہو کر بھیا سے بولی "آہا..... آہا! حجلۂ عروسی تو خوب جگمگا رہا ہے.... کیا جھروکے سے خورشیدِ درخشاں کی شعاعیں چھن کر اسے روشن کیے ہوئے ہیں....یا شمائلہ کے حسن کی کرنوں نے جلوہ بکھیر رکھا ہے۔"

"اری فول سسٹر۔ یہ شمائلہ کے حسن کا کرشمہ ہے کہ یہ کمرہ حجلۂ نور و عطر بنا ہے اور تیرا بھائی چمک دمک رہا ہے۔" ہاشم نے پیار سے بہن کی چوٹی کو مٹھی میں لے کر کہا۔

اچانک شمائلہ نے اٹھ کر جمیلہ کو سینے سے بھینچ لیا... اور پھر تینوں کے قہقہے فضا میں بکھرنے لگے۔

چند لمحات کے توقف کے بعد جمیلہ گویا ہوئی "بھیا' تم نے سوات اور گلگت ہنی مون منانے کے لیے ایک ماہ کی چھٹیاں لی ہیں.... کل مہتاب اور میں لندن سدھار جائیں گے.... تم دس دن کے لیے محولہ پُر فضا مقامات پر ہنی مون مناؤ گے۔ اور میں اس اثنا میں تمہارے لیے قمرولا کی خوب تزئین و آرائش کروں گی.... یقیناً قمرولا میں ماہِ تاباں کی ٹھنڈی کرنیں تم دونوں کے قلوب کو معطر و منور کر دیں گی اور لندن کی پُر بہار فضائیں لہک لہک تمہارے اجسام کو چومیں گی۔"